Sofia Anjum
Taj 13
صوفیہ انجم تاج

سفر کا دَرد

صوفیہ انجم تاج

جے۔ایچ پبلی کیشنز، کراچی

سفر کا درد

صوفیہ انجم تاج

سرورق: صوفیہ انجم تاج
کمپوزنگ: محمد عبدالرحمٰن طاہر (0300-2831089)

اوّل اشاعت: جنوری ۲۰۱۳ء
دوم اشاعت: مارچ ۲۰۱۳ء
طابع: واحد پرنٹنگ پریس، کراچی
ناشر: جے۔ایچ پبلی کیشنز، ۲/۱۹،
اُردو بازار، کراچی

قیمت: ۴۰۰ روپے/ ۲۰ ڈالر

سفر کا دَرد

ناول

صوفیہ انجم تاج

Safar Ka Dard (Novel)

By: Sofia Anjum Taj

(2013)

Contact:

Sofia Anjum Taj
1244, Millbrook Road
Canton,
MI-48188
U.S.A
Phone: (01)313 561 8671
E-mail: s_anjumtaj@yahoo.com

انتساب

اِک لطیف پیکر یعنی اپنی بڑی باجی (عاصمہ سراج) کے نام

جو اپنے بھائی بہنوں پر ساری زندگی جان چھڑکتی رہیں

لیکن برِصغیر کی تقسیم میں ہمارے اور ان کے بیچ ہمیشہ ہی اِک اُونچی دیوار حائل رہی

اور

میرے روز و شب میں غمِ مفارقت کا اِک کانٹا پیوست رہا

صوفیہ انجم تاج

بس یہی کہنا ہے......

زندگی کبھی باہر سے جلائی جاتی ہے۔لوگ آگ میں جھونک دیتے ہیں اور زندگی خاک ہو کر اُڑ جاتی ہے۔اس کی چنگاریاں اُڑتی رہتی ہیں۔ یہ چنگاریاں حُسن بھی بنتی ہیں اور حرارت بھی۔ میں خدا جانے کیسے جلی اور جلی بھی تو اندر ہی اندر جلی۔لوگ رشک کی، حسد کی، نفرت کی آگ میں جلتے ہیں، میں محبت کی آگ میں جلی اور وہ یوں کہ محبت والے جاتے جاتے اپنی یادیں مرے دل میں چھوڑتے گئے۔

یادیں جمع ہونے کے وقت چپ چاپ جمع ہوتی رہتی ہیں اور جمع ہو کر کہیں یک بیک بھڑک جاتی ہیں۔ کچھ آنسو بن کر نکلتیں کچھ حروف بن کر۔

آنسو میرے دامن میں خشک ہوئے۔حروف کے لیے کاغذ کا سہارا لینا پڑا، سو میں نے شاعری شروع کی اور شاعری کو سمجھانے کے لیے اپنی کہانی کہنے لگی۔ یہ کہانی بنائی نہیں گئی بلکہ بنی بنائی کہانی جوئے آب کی طرح نکلنے لگی۔اسی جوئے آب میں نہانے لگی، پینے لگی اور اسی سے وضو کرنے لگی۔سب سے اچھے کام اسی سے ہو سکتے ہیں۔کام لینے والوں کی صلاحیت استعداد اور نیّت پر منحصر ہے۔سو یہ آپ کا کام ہے۔میں جا رہی ہوں......کبھی سیدھی، کبھی پیچ و خم کے ساتھ، مگر ہر حال میں آپ کے سامنے ہوں۔

صوفیہ انجم تاج

میں ایک کہانی لکھ رہی ہوں یا یوں کہیے کہ یہ کہانی خود کو مجھ سے لکھوانے جا رہی ہے۔ ہمارا ہر خیال، ہر قدم، ہر عمل ایک کہانی ہے۔ گزرا ہوا ہر لمحہ ہمیں کچھ نہ کچھ یادوں کی سوغات دے جاتا ہے۔ دراصل آج جو بیت رہا ہے، وہی کل ایک کہانی ہوگی۔

حدیث شریف میں انسان کے عمل کے متعلق ستر یا نوے دفتر آتے ہیں اور ہر ایک دفتر کی وسعت حدِ نگاہ تک ہوگی۔ انسان جو کچھ کرے گا، جو کچھ لکھے گا، جو بھی بولے گا......اس کا ہر فعل و عمل، اچھا یا بُرا......وہ اس کے سامنے آئینہ ہوگا۔ ہمارا ماحول ایک اسٹیج ہے جس پر ہم اداکار کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ دانش مند وہ ہے جو اپنے حرکت و عمل پر بینی نگاہ رکھے تاکہ اس کا عمل اس کے لیے باعثِ عزّت ہو نہ کہ رُسوائی کا سبب۔ ہم نے جو دیکھا اور کہا، وہی ہمارا سرمایہ ہے۔ معمولی سی بات بھی کبھی کبھی اپنے اندر غور و فکر کا ایک جہان پوشیدہ رکھتی ہے۔ میں کسی کی کہی ہوئی چھوٹی سے چھوٹی بات نہیں بھولتی۔ اسے آپ میری خوبی سمجھ لیجیے یا میری کمزوری۔

ہمارے گھر میں ایک خاتون آئیں، رہیں اور اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے چلی گئیں اور جاتے جاتے اپنی زندگی کا تمام سرمایہ ساتھ لیتی گئیں، لیکن یادوں کے گہرے نقوش میرے قلب و ذہن پر ثبت کر گئیں۔ وہ معمولی سی خاتون مجھے کیا بتا گئیں یا مجھے کیا بنا گئیں، میں اپنے قلم کے سہارے اس کے اظہار کی کوشش کر

رہی ہوں۔ زندگی کی اعلیٰ وارفع قدریں صرف طبقۂ اشراف کی ہی جاگیر نہیں بلکہ یہ کبھی کبھی ایسے لوگوں میں بھی موجود ہوتی ہیں جن کے متعلق گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عورت نے مجھ میں جو بنایا ہے، میں اسے بڑی ہی محبت سے بیان کر رہی ہوں۔ اس ملک میں جہاں کہانیوں کے جنم لینے کا ماحول اب نہیں رہا، یہ کہانی اپنا اثر چھوڑے گی۔ ہوسکتا ہے اس کہانی سے کچھ لوگ اثر قبول کریں۔ میری خواہش، میرا ارمان، میری آرزو یہی ہے کہ وہ عورت مجھ میں جو کچھ بنا گئی ہے، ایمان داری سے اسے دوسروں کے لیے چھوڑ جاؤں۔ یہ میرا فرض تھا اور سچ تو یہ ہے قرض اَدا نہ ہوا لیکن میں نے حق مارا نہیں ہے۔ جو کچھ تھا میرے پاس، میں نے دُنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسّر رکھ دیا

جلالؔ لکھنوی

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو دلوں کو واقعی اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور کبھی کبھی چاہتے ہوئے بھی آپ ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ دل کے نہاں خانے میں ایک شریر بچے کی طرح کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گیارہویں کلاس میں تھی۔ یہ عمر کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انسان نہ تو بچّہ ہی رہتا ہے اور نہ ہی اسے بڑوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نہ تو کوئی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی شعوری عمل۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کی تو اُلجھن ہوتی تھی اور اگر کچھ سمجھ میں آ گیا تو اسے بھُلا دینے کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ کسی تجربے سے اگر مڈبھیڑ ہو بھی گئی تو وہ ذہن سے چپکے سے خود بہ خود جانے کیسے نکل جاتا۔ اپنا دل و دماغ تو جیسے کسی بھی منصوبہ بندی کے لیے آمادہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ اپنے دل کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں

منہمک، وقت کے تیزی سے گزرنے سے بے خبر، کبھی جانی پہچانی اور کبھی انجان باتوں میں سر کھپانا، یہی سب زندگی کا سرمایہ تھا۔

شام کا سرمئی وقت پتہ نہیں کیوں مجھے ہمیشہ اُداس کر دیتا تھا۔ شاید شام ہوتی ہی ہے اُداس کرنے کے لیے یا پھر یہ صرف میری سوچ کا قصور ہے اور کسی نے بھی ایسا محسوس نہ کیا ہو۔ واقعی ایک عجیب سی اُداسی پھیل جاتی تھی بلا سبب...... خدا جانے کیوں، لیکن شام کا وقت مجھے بے حد پسند بھی ہے۔ جب آسمان پر لال، عنابی، نارنجی، گلابی اور نیلے رنگوں کو بکھیر کر سورج الوداع کہتا ہے۔ جب آسمان پر بادل کے ٹکڑوں کی چمکتی ہوئی کناری مچل مچل کر اپنا حُسن بکھیرتی ہیں اور پھر ایک طلسماتی کیفیت سے ہر حساس دل بے قرار ہونے لگتا ہے تو میں ان نظاروں میں جھوم اُٹھتی ہوں۔ لمبے لمبے درختوں کی اوٹ سے جھلکتی ہوئی روشنی میری نظروں سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ اپنے کمرے کے سامنے دالان میں بیٹھ کر، کبھی میں اپنی ایک آنکھ بند کر کے اپنے سر کو ذرا سا خم کر کے دیکھتی اور کبھی دوسری آنکھ سے دوسری طرف دیکھتی۔ امّی اور ابا کبھی میرے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے پاس آ کر رُک جاتے تو ابا ضرور اپنے مخصوص لہجے میں ٹوکتے ''کیا ہو رہا ہے بھائی......؟'' اور میں......اور میں کبھی کبھی ان روشنیوں کی آنکھ مچولی کی تفصیل بتانے کی ناکام کوشش کرتی ''دیکھیے نا......اگر آپ اس آنکھ کو بند کر لیں گے تو پھر ایک لمبی گلابی سی روشنی دوسری طرف کو کھنچ جاتی ہے اور کبھی دوسری آنکھ بند کیجیے گا تو......''

انہیں بہت کام رہتا تھا۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں رہتا تھا کہ وہ میری ان واہیات باتوں کو سننے کے لیے مزید کھڑے رہتے۔ صرف مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور مسکرا کر آگے بڑھ جاتے اور میں اسی دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ان روشنیوں کا، ان رنگوں کا تماشا دیکھتی رہتی اور انہیں اپنے آپ میں جذب کرتی رہتی تھی۔

سورج اپنی کرنوں کو نہ جانے کتنی الگ الگ پیالیوں میں رنگ بھر بھر کر دیتا اور کرنیں جہاں جہاں جاتیں وہ ان رنگوں کو روشنیوں کے تانے بانے میں اُبھارتی جاتیں۔ کہیں کاسنی، کہیں سبز، کہیں چمپئی، کہیں زعفرانی۔ پھر ایک جلوۂ صد رنگ بن کر نظروں کے سامنے حُسن میں ڈُوبے ہوِئے پیکر جا بجا اُبھرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد انسان ایک عجیب سی کیفیت میں، ایک سُرور میں ڈُوب جاتا ہے۔ میرا بھی پورا وجود فرطِ مسرّت سے ان نظاروں کے رُوبرو جھوم اُٹھتا ہے۔ میں واٹر کلر کے پیپر پر رنگوں کو بکھیرتی، ٹھیک اسی طرح جس طرح سے آسمان اپنے کینوس پر ہر شام رنگ پاشیاں کرتا ہے۔ میں اپنی اس کم عمری میں بھی یہی سوچتی کہ قدرت کے خزانے میں کیا کچھ نہیں ہے۔ قدرت نے انسان کو ایسی ایسی دولتوں سے نوازا ہے جس دولت کو انسان کبھی آنکھ بھر کر دیکھتا بھی نہیں۔ اگر کسی کو روک کر یہ بتانے کی کوشش بھی کی کہ ''دیکھو دیکھو آج آسمان کتنا خوب صورت لگ رہا ہے'' تو وہ شخص صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر کر آگے نکل جاتا اور میں پھر سے اپنی دھن میں مگن ہو جاتی۔

لیکن ان دنوں کی ایک شام بڑی عجیب سی شام تھی۔ اس شام کی سیاہی، اُجالوں اور رنگوں کو اپنے سیاہ آنچل میں کچھ اس طرح چھپا کر پوری دھرتی کو افسردہ بنا چکی تھی کہ میرا دل بے حد غمگین ہو رہا تھا۔ مجھے کسی سے بھی بات کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی لیٹی گھر کے ہر فرد کی اُونچی نیچی آوازوں کو سُن رہی تھی۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی چیز کی طلب تھی۔ باورچی خانے سے برتنوں کی کچھ بھونڈی، کچھ سریلی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ گھر میں کام کرنے والیاں اور کام کرنے والے بھرے رہتے تھے۔ کچھ لوگ گاؤں سے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا شوروغل مختلف لہجوں کے ساتھ میرے کانوں سے ٹکراتا رہا۔ میں تو خود بھی اس شوروشرابے کا حصّہ تھی۔ مجھے کام کرنے والیوں، جنہیں ہم لوگ ''بُوا'' کہتے تھے، کے ساتھ کام کاج کرنا، ان کے ساتھ مِل جُل کر رہنا، ہنسی مذاق کرنا، ہر پل ان لوگوں کی معصوم باتوں سے لطف اندوز ہونا، پھر اپنے بھائی بہنوں کو ان کے ہی انداز میں بول کر سنانا میرا ایک محبوب مشغلہ تھا۔

ایک دوسری خاتون مانو کی اماں، جو ہم لوگوں کے گھر میں کام کرتی تھیں، ان کے دو بچے تھے، ایک تیرہ سال کا لڑکا تھا اور ایک پانچ سال کا۔ چھوٹے بیٹے کا نام آنو تھا اور بڑے کا نام مانو تھا۔ اس علاقے کے سارے لوگ بے چارے مانو کو منوا کہہ کر پکارتے تھے، حالانکہ مانو تو خود ہی منور حسین کا بگاڑ تھا لیکن اس پر بھی لوگوں کو تشفی نہیں ہوئی تو مانو سے منوا کر دیا اور ماں کو لوگ مانو کی اماں کہہ کر پکارتے۔ مانو کی اماں

کبھی دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر یہ کہتیں کہ:

''خدانخواستہ منوا کی خونی پیچش اچھی ہوجائے گی بُنّی تو بھر محلّہ (پورے محلّے) میں گلگلہ بانٹیں گے۔''

ہم لوگ فوراً ٹوکتے، ''ہائے مانو کی اماں خدانخواستہ کیوں بول رہی ہو؟ انشاءاللہ بولیے۔''

تو کہتیں، ''ارے اوہی (وہی) جی خدانخواستہ یا انشاءاللہ۔ ایک ٹھو ماشاءاللہ بھی تو ہووے ہے۔''

پھر ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوجاتا۔ ہمیشہ ہم لوگ ان کے جملوں کو درست کرتے لیکن وہ بے چاری بھی ہمیشہ غلط ہی بولتیں اور بولتے وقت زیادہ تر ہم لوگوں کو مسکرا کر دیکھتیں کہ خدا جانے صحیح بول رہی ہیں یا غلط۔ مانو بھی کچھ کم نہیں تھے۔ ایک دن بھیا اسے سمجھا رہے تھے کہ:

''مانو دل لگا کر پڑھو تو ایک دن تم بھی ایک بڑے آدمی بن جاؤ گے اور پھر پوری دُنیا کی سیر کرو گے۔ دیکھو فلاں آدمی اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو کر امریکہ چلے گئے، ویسے ہی تم بھی جا سکتے ہو۔''

تو مانو صاحب نے جواب دیا کہ:

''ارے بھیا امریکہ کا ہے، لوگ تو اِتّی دُور ڈھاکا چلے جاہیں۔''

پھر سبھوں کا قہقہہ بلند ہوتا تو وہ تعجب سے سب لوگوں کی طرف دیکھنے لگتا۔

میرا چھوٹا سا نیلی دیواروں والا کمرہ گھر کے بالکل درمیان میں تھا۔ اس لیے ہر آنے جانے والوں کی خبر مجھے فوراً مل جاتی تھی۔ اپنی ساری کتابیں اور دلچسپی کا سارا سامان بھی اسی کمرے میں رکھتی تھی۔ کمرے میں کھڑکی کے قریب ایک بڑی سی لکڑی کی میز ہوتی تھی جس پر میری زندگی کا سب سے پہلا بینجو (Banjo) رکھا رہتا تھا، جس کو میں نے اپنے پاکٹ خرچ سے خریدا تھا۔ شیلف پر ساری کتابیں ہوتیں۔ ایک چھوٹی میز اور کرسی لیمپ کے ساتھ ایک کونے میں ہوتی تھی جس پر بیٹھ کر میں لکھتی پڑھتی تھی۔ بڑی میز پر ایک GEC کا ریڈیو تھا جو چھوٹے بھیّا نے اپنی پہلی تنخواہ سے خرید کر ہم لوگوں کو دیا تھا۔ وہ ریڈیو میرا ہم خیال، ہم زبان اور ہمراز جیسا تھا۔ اسی میز پر واٹر کلرز، رنگوں کی پیالیاں، برش اور پنسل بجی رہتی تھیں۔ وہیں

اسٹول پر بیٹھ کر میں گھنٹوں پینٹ کرتی رہتی تھی۔

میرے کمرے کی کھڑکی پورب کی طرف کھلتی تھی، جہاں سے طلوع آفتاب کا منظر صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ سورج صبح صبح کمرے میں جھانکتا اور مجھے بستر سے اُٹھانے کے لیے اپنی شوخ کرنوں کو جیسے ایک اشارہ کر دیا اور میں واقعی انہیں کرنوں کی شوخیوں سے اُٹھتی بھی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ پچھم کی سمت کھلتا تھا جہاں سے وہی سورج نہ جانے کتنے سارے رنگوں سے لپٹ لپٹ کر ڈوبنے لگتا تھا۔ ابا کی شوق سے لگائی ہوئی چنبیلی مغرب ہوتے ہی اپنی خوشبوؤں سے کمرے کو معطر کر کے اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔ آنگن کی نرم گھاس شام میں پانی کی ٹھنڈی پھواروں سے کچھ اور بھی سرسبز ہو کر لہلہا جاتی۔ وہیں پر پلنگ بچھا دیا جاتا جس پر سفید چادر بچھی ہوتی تھی اور کشیدہ کاری کیا ہوا سفید غلاف تکیے پر چڑھا دیا جاتا۔ انہی ساری چیزوں سے گہری گہرائی میں اپنے روز و شب کو سنوارتی رہتی اور محظوظ ہوتی رہتی تھی۔ قدرت کا حسن میرے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ میری زندگی کا ایک بیش بہا سرمایہ تھا اور ہے۔

ہاں تو میں اس اُداس شام کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ شام...... اس شام مجھے کچھ بھی تو سنائی نہیں دے رہا تھا کہ کون کیا بول رہا ہے، کون کس کو پکار رہا ہے اور اگر پکار رہا ہے تو کیوں پکار رہا ہے۔ ساری آوازیں جیسے بے ترتیبی سے گڈمڈ ہو کر میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اپنی بدحواسی کی وجہ جیسے خود بھی نہیں جانتی تھی۔ میں سوچنے لگی...... یا اللہ میں اس قدر بے چین کیوں ہوں۔ آج یہ کمرہ مجھے وہ لذّت کیوں نہیں بخش رہا ہے جیسا کہ یہ مجھے روز دیا کرتا تھا۔ یہ کون سے درد کا سوگ منا رہا ہے۔ میں یک بیک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے اگر اور لیٹی رہی تو دماغ شاید پھٹ جائے گا۔ دالان میں جا کر میں نے پیتل کے بدھنے سے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی پھواریں اپنے منھ پر ماریں اور گھڑے سے سوندھا ٹھنڈا پانی ڈھال کر ایک سانس میں پورا گلاس پی گئی۔ کچھ آرام تو ضرور ملا لیکن ایک بے قراری اپنی جگہ پہ تھی اور اسی بے قراری میں اُٹھ کر گھر سے باہر چلی گئی۔ باغ کا ایک چکّر لگایا۔ کچھ تازگی تو ملی، لیکن ماحول میں گھلا ہوا وہ غم ابھی

رُخصت کہاں ہوا تھا۔ وہ غم جو دل و دماغ میں رچ بس چکا تھا، وہ تو اب رہتی دُنیا تک اپنی یاد دلاتا رہے گا۔ آج پھر کئی ہفتوں کے بعد کسی کے قدموں کی آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شاید وہ خود اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ ودو میں اپنے درد کی شدّت میں کچھ کمی پائے، لیکن اس بے کس کا خاموشی سے ہانپتا ہوا سراپا میرے دل و دماغ میں کچھ اس طرح سے بس گیا تھا کہ اسے اپنے دل سے نکالنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر اس وقت تک، جب تک کہ کسی کے قدموں کی آواز صبح و شام میرے کانوں سے ٹکراتی رہے گی۔ وہی کھڑاون کی مانوس آواز، جو میں ایک مدّت سے سنتی چلی آرہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو بڑھ کر میں اپنے دامن میں چُن لینا چاہتی تھی۔ ان موتیوں کی قدر و قیمت کا احساس، میری اس کم عمری میں، نہ جانے کہاں سے مجھ میں رینگتا ہوا پیوست ہو گیا تھا...... یہ تو خدا ہی جانے۔ میں تو ایک ادنیٰ سی، ایک کم عمر لڑکی تھی، لیکن اُس وقت بھی میں انسان اور احترامِ انسانیت پر اپنا بھرپور یقین رکھتی تھی۔ میں نے ایسے ایسے واقعات سے متصادم ہونے کے لیے خود کو تیار ہی کب رکھا تھا۔ ایسی عمر میں تو انسانی ذہن میں زندگی کی صرف آسانیاں، حُسن و رعنائیاں ہی دل و دماغ میں گردش کرتی ہیں۔ مشکل مشکل باتیں اور زندگی کی تلخیوں کے بارے میں عمر کی ان منزلوں میں انسان سوچتا ہی کب ہے؟

میں پھر اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ امّی میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھنے لگیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امّی۔ رات دیر تک پڑھنے سے کچھ تکان سی ہو گئی ہے۔"

امّی کے جانے کے بعد میں سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی کہ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ نے میرے اندر پھر وہی اضطراری کیفیت پیدا کردی جس کی تاب نہ لاکر میں اپنے دونوں کانوں کو اپنے ہاتھوں سے دباتی گئی...... میرے معبود میں ان قدموں کو سننے کی طاقت کہاں رکھتی ہوں...... لیکن کھڑاون کی وہ آواز میرے اور قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ اس تھکی ہوئی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

''بنّی! توری (تمہاری) امّی تو کو (تم کو) بلاویں ہیں۔''

میں نے تکیے سے اپنا سر اُٹھایا اور کسی کی اُداس نظریں میرے دل کو چیرتی چلی گئیں۔ میں بمشکل یہی کہہ سکی کہ:

''ابھی آتی ہوں۔''

میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی بتولن بی امّی کے پاس پہنچ چکی تھیں اور وہیں پہ کھڑی امّی کے حکم کا انتظار اپنی تھکی تھکی نظروں سے کرتی رہیں۔ ہر شخص ان کو بتولن بی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

میں کچھ تاخیر سے ہی اپنے کمرے سے نکل کر امّی کے پاس گئی۔ جب تک بتولن بی بازار سے سودا لانے کے لیے پیسے اور چیزوں کی فہرست لے کر لنگڑاتی ہوئی بوسیدہ چادر میں لپٹی لپٹائی اپنے مخصوص انداز میں آنگن کے پچھلے دروازے سے جاتی ہوئی نظر آئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں دالان میں آرام کرسی پر آکر تھکی تھکی سی ڈھیر ہوگئی۔ درد میں ڈوبے ہوئے اس سراپے کو دیکھ کر میرا پورا وجود تھکاوٹ سے اور بھی چُور ہوگیا۔ خود بہ خود میری آنکھیں جیسے بند ہونے لگیں۔ آنکھوں کی نمی میں تیرتے ہوئے وہ سارے منظر یکے بعد دیگرے اپنی جھلکیاں دکھانے لگے اور میں ساری دُنیا سے بے خبر ہوگئی۔ میں ماضی کی دھوپ چھاؤں کے دوش بہ دوش اپنے تصوّر میں چلنے لگی۔ پھر میں ایک ایک پل کی، کبھی کسی کھردری سطح پر اور کبھی پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ ساتھ، کبھی مسکراتی ہوئی اور کبھی بلکتی ہوئی اپنے خیالوں میں آگے بڑھتی ہی چلی گئی۔ یوں تو زندگی خود ہی تغیر پذیر ہے جو کہ مختلف مراحل اور ادوار سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی کسی کی زندگی میں کچھ اس قدر اٹھا پٹک کا سماں رہتا ہے کہ انسان محض ایک تماش بین کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

میرے والد نے پٹنہ ہائی کورٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد سلطان گنج، پٹنہ (بہار) میں سکونت اختیار کرلی تھی، جہاں انہوں نے اور میرے چھوٹے چچا نے مل کر گنگا ندی کے بہت ہی قریب کئی کٹھوں میں اپنا اپنا مکان بنوایا تھا۔ہم سبھوں کو نئے مکان میں منتقل ہونے کی بے حد خوشی تھی۔اس لیے کہ چچیرے بھائی بہنوں کے ساتھ رہنے کے، ہنسنے کھیلنے کے دن آرہے تھے۔

جب ہم لوگ سلطان گنج منتقل ہو گئے تو نئے آنگن اور نئے دالانوں سے بھی دل آہستہ آہستہ مانوس ہونے لگا۔امّی کئی دنوں تک اپنی خانہ داری کے سامانوں کو جگہ پر رکھتی رہیں۔نئی ترکاری والی، نئی دھوبن اور نئے نئے فقیروں سے تعارف ہوا۔ جو جو فقیر عدالت گنج والے مکان میں آتے تھے، وہ سبھی اب ہم لوگوں سے چھوٹ چکے تھے۔بے چارے اگر چاہتے بھی کہ نئے مکان کو چلیں تو نہیں آسکتے تھے۔اس لیے کہ ان دونوں مکانوں کے درمیان رکشے سے، قریب ایک گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ان میں کئی فقیروں کے نام مجھے بہت زمانے تک یاد رہے۔ ویسے فقیروں کے نام ہی کب ہوتے ہے اور اگر نام ہوا بھی تو کچھ اس طرح کے......

''ارے وہ لنگڑی نہیں آئی۔''

''بھئی وہ کالی پگڑی والا بوڑھا جو ٹھیک مغرب کے وقت آتا ہے۔''

''ارے وہی گیروا کپڑے والا فقیر۔''

ویسے اگر سوچا جائے تو اس طرح کے جملوں کو اپنی زبانوں سے اَدا کر کے انسان واقعی خود کو انسان ثابت نہیں کر سکا۔ اس روئے زمین کی مخلوق کے لیے میں دست بہ دُعا ہوں کہ خدا ان کے جذبات اور احساسات کی سطحوں پر جمی ہوئی برف پگھلا دے اور انسان کی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ اس کی عقل و حرکت بھی انسان کا ہی رُوپ دھار لے۔ سچ پوچھیے تو یہ بھی انسان کے ظلم وستم کی ایک کہانی ہے جہاں انسان، دوسرے انسان سے اس کا نام تک جاننے کی ایک ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کرتا ہے۔ جب کہ ہر انسان کے لیے اس کا نام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ صفت سے موسوم کیا جانا ہر کسی کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔ اپنے نام کی سماعت انسان کی اندرونی حسوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ سوچنے والی بات ہے کہ کسی فقیر سے اس کا نام دریافت کر کے، اگلی بار اسے اگر اس کے نام سے مخاطب کیا جاتا تو اسے کتنی رُوحانی مسرّت حاصل ہوتی اور اسے اس مسرّت سے ہم کنار کر کے ہمیں کس قدر آسودگی حاصل ہو سکتی تھی۔ بہر کیف!

وقت گزرتا گیا اور اب یہ نئی جگہ پرانی لگنے لگی تھی۔ اب یہ نیا گھر اپنا گھر لگنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسی گھر میں ایک مدّت سے رہتی چلی آرہی ہوں۔ انہیں دنوں پتہ چلا کہ امّی کو ایک بازار کرنے والی خاتون بھی مل گئی تھیں، چنانچہ ایک شام جب میں اسکول سے واپس آئی تو ایک نورانی چہرے والی سن رسیدہ خاتون دالان کے تخت کے ایک کونے پر بیٹھی اپنی ساڑی کے آنچل کے کھونٹ سے کچھ باندھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کے چہرے کی ہلکی سی جھرّیاں صاف بتا رہی تھیں کہ ایک طویل عمر کو گزار چکی ہیں۔ ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ نہ جانے کتنی کہانیاں سنانے کو بے قرار ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ ایک وسیع ڈُوبتے سورج کے اطراف کی بکھری روشنیوں اور رنگوں کی اوٹ سے کوئی بادل کا ٹکڑا ایک انسانی چہرہ لیے ہمارے گھر کے دالان میں بچھی چوکی پر آبیٹھا ہے۔ وہ امّی کے دوش بہ دوش بیٹھ کر بازار کی

مہنگی سستی چیزوں کا تذکرہ کررہی تھیں۔ جھوم جھوم کر سبزی منڈی کے سبز و تازہ ماحول کو اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح بیان کررہی تھیں کہ آنکھوں کے آگے ہریالی چھائی جارہی تھی۔

اُردو کے الفاظ کو تو بکثرت استعمال کرتیں مگر وہی ذرا سا تلفظ کی خرابی سے ان کی باتوں کا ذائقہ اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ پان کھانے کی شوقین اور دانتوں کا عنابی رنگ ان کی ایک ہلکی سی بھی مسکراہٹ سے نمایاں ہورہا تھا۔ پان بھی اس تواتر سے کھاتیں کہ ہونٹوں کے دونوں کونوں سے پتلی سرخ ریکھی ٹھوڑی کی طرف بڑھتی نظر آتی۔

بتولن بی کپڑے بہت سادہ پہنتیں۔ سوتی کی کوردار ساڑی یا سانتا پوری ساڑی جس کے آنچل کے کونے میں ان کی چابیوں کا گچھا بندھا رہتا جسے وہ چلتے پھرتے اپنی پشت پر پھینک دیتیں تا کہ اس کے وزن سے ان کا آنچل ان کی پشت پر جما رہے۔ کان میں اپنی ماں کی دی ہوئی ایک بہت ہلکی سی بالی پتہ پہنے رہتیں جسے انہوں نے کبھی نہیں اُتارا۔ پاؤں میں کھڑاون رہتا اور بائیں پاؤں میں تانبے کا ایک لچھا جو چلتے وقت بہت ہی ہلکے سے بھی کھڑاون سے ٹکرا جاتا تو ایک خاص قسم کی سریلی آواز پیدا کرتا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوتیں، اس آواز کو سنتے ہی سب جان جاتے کہ بتولن بی آنگن میں آچکی ہیں۔ پاؤں میں تانبے کا کڑا جو لڑکھڑاتا رہتا تھا، اس کو وہ بڑے اعتقاد کے ساتھ پہنتی تھیں کہ وہ ان کے پاؤں کے درد کے لیے مفید ثابت ہوا تھا۔ پان کا ایک بٹوہ ان کی کمر سے ہمیشہ لٹکا رہتا جس میں پان کی کھلیوں کو یکے بعد دیگرے نکال نکال کر منھ میں ڈال جاتیں۔ امّی کو صاحب صاحب کہہ کر مخاطب کرتیں۔ ہمیشہ وہ اپنے اچھوتے نظریے کو بہت ہی پُر زور اور پُر جوش طریقے سے پیش کرتیں......

''نہیں صاحب، آپ نہیں جانتی ہیں......آج کل سبزی اور گوشت والوں کا دماگ (دماغ) بہت خراب ہوگیا ہے۔ سیدھے منھ بات نہیں کرتا ہے۔''

مجھے یاد ہے کہ پہلی بار جب میں نے انہیں دیکھا تھا تو سلام کر کے ان کے بہت قریب گئی تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس سلام کے بدلے وہ پانچ منٹ تک دل کو لبھانے والی ڈھیر ساری دُعائیں دیتی چلی گئیں......

''اللہ میاں تم کو اپنی چھاجت (حفاظت) میں رکھے...... پھسٹ ڈیجن (فرسٹ ڈویژن) سے پاس کرو...... پیارا پیارا دولہا ملے...... ساس نندوں کا دل لوٹو۔''

اور خدا جانے کیا کیا۔ امّی بھی ان کی ہر ادا اور ہر بات سے خوب لطف اندوز ہوتیں۔ بات کرتے کرتے ایسی تولہ ماشا ہونے لگتیں کہ لوگ خاموشی سے ان کے لہجے کا اندازہ لگانے لگتے کہ یہ ناراض ہونے والی ہیں یا سنبھلنے والی ہیں۔

''بتایئے صاحب! آپ جو کل بولیں کہ ہائے گوشت میں بہت ہڈی ہے تو اِہی (یہی) بات اوجھاڑو مارے کو ہم بھی بولے کہ مَرے او گلام نبی (غلام نبی) اتنا ہڈی کا ہے کو ملا دو ہو بھائی، تو کہتا ہے سور کا بچّہ، اپنی بیگم سے پوچھو (پوچھنا) کہ بے ہڈی کا جناور (جانور) کہاں ملے ہے، ذرا ہم کو بھی بتا دیں۔ بتایئے صاحب کتنا بڑا پھتوری (فتوری) اور جبان دراج (زبان دراز) ہے۔ ارے صاحب ٹھس ٹھس بولتا ہے کی، کچھ بولے کا داؤ ہی نہی دیتا ہے پھتوری (فتوری)۔''

بتولن بی مبالغہ آرائی میں بڑی ماہر تھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس قدر زور دے کر بیان کرتیں کہ بیان سے باہر۔ کسی بھی واقعے کو اس شدّت سے بیان کرتیں کہ لگتا جیسے واقعی کوئی بہت سنجیدہ بات ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ہر طرف ہندو مسلمان کے فسادات کے ہنگامے تھے جس کی وجہ سے ہر طرف لوگ ذرا سی بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے یعنی جوش میں آجاتے تھے۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ ایک روز بتولن بی بازار سے ہانپتی کانپتی ہم لوگوں کے آنگن میں آئیں۔ لوگوں نے ان کی

ایسی حالت دیکھی تو پوچھنا شروع کیا:

''کیا ہوا بتولن بی، کیا ہوا۔ بتائیں بھی کہ آخر آپ اس قدر ہانپ کیوں رہی ہیں؟''

سانس لینے میں جب تھوڑا آرام ہوا تو بولیں، ''ارے صاحب کیا بتائیں۔ آج بجار (بازار) میں گولی چل رہی ہے۔ سمجھیے کہ ایک گولی تو ٹھیک میری کن پٹی سے ہو کے گزری۔ ارے بھائی ہم تو ہوئیں (وہیں) پر گرنے والے تھے کہ سبزی والا آ کے میرے پکڑنے لگا تو ہم اوکو (اس کو) بولے کہ ہٹو ہٹو میرے ہاتھ مت لگیہو (لگاؤ)۔ پھر تو بابو ہم ایہی (اسی) لنگڑی ٹانگ سے بھاگے بھاگے ہیاں (یہاں) دَم لے رہے ہیں۔ ہواں بازار میں تو سانس ایسی اتھل پتھل ہو رہی تھی کہ لگتا تھا اب دَم نکلا کہ تب دَم نکلا......ارے کوئی پانی پلا دو، سانس اُکھڑی جا رہی ہے۔''

سب لوگ اپنا منھ چھپا چھپا کر ہنس رہے تھے، لیکن ان کو اس بات کی کوئی خبر نہیں رہتی کہ لوگ ان ہی کی باتوں پر ہنس رہے ہیں، بالکل بے خبر۔ کسی نے پوچھا کہ:

''کا بتولن بی آپ نے گولی اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھی تھی؟''

''ارے ہاں بھائی گولی گزر رہی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں......اور کا......کا سوچو ہو تو رے سے مجاق (مذاق) کر رہے ہیں کا۔''

پھر کیا تھا، گھر کا گھر ہنستا رہا اور محظوظ ہوتا رہا۔

کبھی کبھی بتولن بی ہم لوگوں کے یہاں بہت سویرے آ جاتیں۔ اتنا سویر جس وقت امّی اور ابا باغبانی کے لیے باغ میں جاتے تھے۔ باغ میں جانے سے پہلے یہ لوگ ایک کپ چائے اور ناشتے میں پپیتے، چنے اور کھیرے کا بہت ہی ہلکا ناشتہ کرتے۔ بتولن بی کے لیے بھی امّی چائے بنواتیں۔ ہم لوگ تو زیادہ تر اس وقت بستر میں ہی ہوتے تھے لیکن ایک بار اگر بتولن بی آنگن میں آ گئیں تو پھر سارے لوگوں کی

آنکھ خود بہ خود ان کی آواز سے کھل جاتی۔ کبھی تو وہ ٹھہا کے لگا کر ہنستیں، کبھی زور زور سے اپنے سرکار کو یاد کر کے روتیں اور کبھی کسی نوکر پر بگڑ رہی ہوتیں۔

''ارے سکھڑوا، کا آئیں بائیں شائیں کرتا چلے ہے رے...... دیکھیے صاحب ہم اس چھوکرے کو باہر سڑک پر اپنی آنکھ سے دھما چوکڑی کرتے دیکھا ہے...... بول...... بول...... بول نا رے۔''

سکھڑوا بھی بتولن بی کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔

''ہائے کب ہم کو دیکھ لیو (دیکھ لیا)۔ بتولن بی ہم تو ہواں (وہاں) گئے بھی نا تھے۔''

بتولن بی اپنے پیر سے کھڑاون نکال کر اس پر اپنی پوری طاقت سے پھینکتیں، لیکن سکھڑوا وہاں سے بھاگ جاتا۔

''دیکھتی ہیں صاحب کیسا تیوری بدل کے بات کرتا ہے۔ سڑک پر چھوکرے سب کے ساتھ خوب اُچھلتا ہے اور میرے کنکھی سے دیکھتا ہے، اوہی وقت ہم بولے تھے کہ چلو کوٹھی میں تب تورے بتاویں گے۔''

منجھلے بھائی جان انگلینڈ سے لپٹن چائے کے Tea Bag لے کر آئے تھے جو کہ اس زمانے میں ایک نئی چیز تھی۔ بتولن بی اسے اپنے ہاتھ میں لے کر بہت ہی پُر اشتیاق نظروں سے گھما گھما کر دیکھ رہی تھیں۔ کبھی اسے سونگھتیں، کبھی اسے اپنے ہاتھوں پر رکھ کر تولتیں، پھر بولیں۔

''بتاؤ ای (یہ) فرنگی سب کیسا کیسا چیز نکالتا ہے۔ بتاؤ کاغذ سمیت گرم پانی میں ڈال دو اور چائے تیار۔''

پھر دوسرے دن آئیں تو بولیں۔

''ہم کو ہیاں (یہاں) والی چائے مت دیہو بُنّی۔''

میں نے پوچھا، ''تب کون سی چائے پیئیں گی؟''

بولیں، ''ارے بھائی او تو بیج (وہ تعویذ) والی چاپئے لاؤ نا جو بابو ولایت سے لے کر آئے تھے۔''

پھر سارے لوگ ہنسنے لگے۔ جب سب لوگ ہنسنے لگتے تو بے حد معصومیت سے اپنا سر اُٹھا کر آنکھ مچکا مچکا کر سب کو دیکھتیں، جیسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہو۔

''ای سارے کے سارے ہنس کا ہے لگے۔''

اپنے مخصوص جوشِ بیان کے ذریعے وہ اپنی باتوں کا ذائقہ کچھ اس طرح بڑھاتیں کہ آنگن قہقہوں سے گونج اُٹھتا مگر انہیں سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر لوگ کس بات پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد بتولن بی کے ساتھ ایک بہت ہی پیاری سی لڑکی بھی آئی جو کہ ان کی پشت سے لگی بیٹھی تھی۔ بڑے ہی پُر اشتیاق نظروں سے ہم لوگوں کے گھر کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی کچھ بولتا تو اُدھر دیکھتی، مسکراتی مگر بالکل خاموش رہتی۔

''اجی بُنّی، ای (یہ) میری بیٹی ہے جی۔ ان کا نام ہے سحرؔ''

سحران کے بڑھاپے کی اولاد لگ رہی تھی۔ پھر بیٹی کی طرف رُخ کر کے بولیں۔

''ہائے کا بابو، اپنا نام اپنے سے بتاؤ نے...... ہاں اے ہی (یہی) آنکھ میں کان ایک ٹھو بیٹی ہے۔''

سحر مسکرانے لگی۔

سحر اپنی ماں کے مقابلے میں کافی لمبی اور چھریرے بدن کی تھی۔ کھڑا ناک نقشہ، دو قندیل کے جیسی چمکتی آنکھیں اور چمپئی رنگت نے اس کے حُسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ گلے میں کالی ڈوری سے لگی ایک سبز تعویذ، جو اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ ناک میں نیم کا ایک خشک تنکا پڑا تھا جس سے اس کے چہرے کی سادگی اور بڑھ گئی تھی۔ چہرہ بہت بھولا لگ رہا تھا۔ سوتی گلابی شلوار جمپر مختلف رنگوں سے رنگے لہریا کے سوتی ڈوپٹے کا ست رنگی عکس اس کے چہرے پر چمک رہا تھا جو سر سے اوڑھے تھی۔ اپنی پتلی پتلی اُنگلیوں

میں چاندی کے چھلوں کو گھماتی ہوئی بولنے اور نہ بولنے کی کشمکش میں ماں کی پیٹھ سے لگی، سر کو جھکائے ہوئے، شرمائی شرمائی سی دالان کے تخت پہ بیٹھی تھی۔ ماں نے پھر ٹوکا۔

''ہائے ہائے، ایسے چھپوکا ہو (چھپتی کیوں ہو)۔ بات کرو، چیت کرو، ذرا ہنسو بولو...... دیکھو بابو، اگر منھ لگی بنوگی تو اگلی بار سے تو کو (تم کو) کوٹھی میں نالا دیں گے سمجھیو......''

لیکن اس دن سحر قریب قریب خاموش ہی رہی۔

ماں پھر کوئی اسی قسم کی باتیں کرنے لگیں تو سحر صرف اپنے دھیمے لہجے سے نسبتاً زور سے ''اماں'' بول کر رہ جاتی۔ جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ سب کے سامنے میرے بارے میں اتنا مت بولو۔ غیر کی موجودگی کا احساس اور اس کی طبیعت کی نرمی اور اس کی سادگی کی وجہ سے اس کے گلاب چہرے پر حیا اور شرم کی لالی اور بھی اُبھر جاتی۔ اس کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کی ساری چیزوں کو بہ اطمینان دیکھتی جائے لیکن اسے کوئی نہ دیکھے۔ شاید اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جس کی نظر اس پر پڑتی ہے وہ اس پر ٹھہر جاتی ہے اور پھر ان ٹھہری ہوئی نگاہوں سے وہ خوف کھانے لگتی ہے، لیکن اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ بغیر کسی سنگار کے بھی ایک نایاب موتی کی طرح چمکتی رہتی ہے اور کسی بھی خوب صورت شئے کو اس طرح سے گھورنا ایک فطری عمل ہے۔ کمسن لڑکیوں کو خود کہاں خبر ہوتی ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہیں۔ انہیں کون کس نظر سے دیکھ رہا ہے اور اس کی زندگی کا سبز موسم اس سے کتنا قریب یا کتنا دُور ہے۔ ماں کی ہدایت کے مطابق وہ اپنی اُنگلیوں سے اپنے دوپٹے کے آنچل کو ہر لحظہ اپنے بالوں پر اٹکائے جا رہی تھی۔

بتولن بی کی باتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ ماں کے آنچل کو اپنی اُنگلیوں میں گھما گھما کر لپیٹتی ہوئی سر جھکا کر مسکرا مسکرا کر سبھوں کی بات سنتی رہتی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بیٹھی بیٹھی تھک چکی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بتولن بی کے پاس سے اُٹھالوں اور باہر باغ میں لے جا کر

تازہ ہوا کے جھونکوں سے اس کا تعارف کرادوں تا کہ سحر بالکل تازہ دَم ہو جائے، لیکن شروع شروع کی ملاقات میں دو انسانوں کے بیچ میں قدرتی طور پر ایک جھجک کی دیوار حائل رہتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ انسان اسے ایک کنارے کر کے ایک دوسرے کے قریب آتا ہے۔ کبھی یہ قربت عارضی ہوتی ہے تو کبھی دائمی۔ مجھے بھی ایک جھجک سی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں نے اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے اپنی دلی خواہش پر عمل کیا۔ اس کی نظریں بھی جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ...... ''میں تمہارے محلّے، تمہاری گلیوں اور تمہارے گھر میں بس ایک انجان سی، بہت ہی تنہا تنہا سی لڑکی ہوں لیکن اگر تم نے مجھے اپنی سہیلی بنالیا تو میری زندگی میں بہار آجائے گی۔ میں تم سے قریب ہو جاؤں گی اور کھلی فضا میں سانس لینے لگوں گی۔ مجھے میرے حبس موسم سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی، چھٹکارا تو مل جائے گا۔''

مجھے تو یہ پتہ تھا کہ وہ ایک نہایت بوسیدہ سے گھر میں رہتی ہے۔ اسی لیے پتہ نہیں کس طرح مجھے اس کی آنکھوں میں حسرت کی ایک جلتی بجھتی لَو نظر آئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ہم لوگوں کے گھر میں آکر اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ باغ کی طرف آنے کی دعوت دی۔ وہ ذرا جھجک کے ساتھ ماں کی پشت سے نکل کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ گھر سے باہر باغ کی طرف جانے لگی۔ میں نے اپنے باغ کے کونے کونے سے اسے متعارف کرایا۔ دیسی اور انگریزی پھولوں کی کیاریاں گھر کے سامنے موسم کے حساب سے ہمیشہ ہی سجی رہتیں۔ سلویا (Sylvia) کی گھنی اور اُٹھتی ہوئی سرخ قطاروں کی پشت میں سوئیٹ پی (Sweet pea) کی پتلی پتلی لکڑیوں پر چڑھتی ہوئی گھنی بیلیں اور اس کی مسحور کر دینے والی خوشبوؤں میں ڈہلیا (Dahelia)، فلوکس اور جیرینیم کے رنگ برنگے عکس کے بیچ سحر کا سراپا باغ کی دلکشی میں اور اضافہ کر رہا تھا۔ باغ میں گھاس پر وہ اس قدر آہستہ آہستہ قدم رکھ رہی تھی جیسے اس کا کوئی بھاری قدم پھولوں کو ناگوار نہ گزرے۔ واقعی سحران کے بیچوں بیچ کسی نرم موسیقی کی طرح بہی

چلی جارہی تھی۔ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے وہ رنگ برنگے پھول اس کے قدموں کے رکھنے سے ہی اُگ رہے ہیں اور میں اسے پھولوں اور اُڑتی ہوئی تتلیوں کے بیچ و بیچ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں ہورہا تھا کہ یہ وہی شرمائی شرمائی سی لڑکی ہے جو ابھی ماں کی پشت سے اُٹھ کر آئی ہے۔ میں نے سحر سے کہا کہ ''تمہارا لہریا کا دوپٹہ بہت ہی خوب صورت ہے'' تو سحر صرف مسکرا کر رہ گئی۔ واقعی مجھے اس کا دوپٹہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔لہریا کی رنگائی باقی دوسرے نقش و نگار سے بہت ہی مختلف ہوتی تھی۔

مختلف رنگوں کے امتزاج سے کچھ ایسی خوب صورتی سے دھاریوں کو ایک کے بعد دوسری ڈال کر رنگا جاتا تھا کہ دوپٹے میں ایک خاص طرح کا طلسم پیدا ہو جاتا تھا۔ جارجٹ، شفون، کانجی ورم اور سلک پر لہریا کا چھاپ بڑا ہی کلاسیکی لگتا تھا۔اس کی رنگائی میں بڑی ہی صفائی اور نزاکت ہوتی تھی۔سفید دوپٹے پر رنگ برنگی دھاریاں بے حد خوشنما لگتی ہیں۔میرے خیال میں سحر نے اپنی اماں کے وضع کو اپنایا ہوگا۔ میں نے گھر میں آکر جیسے ہی سحر کے دوپٹے کی تعریف کی تو بتولن بی فوراً بول اُٹھیں۔

''ارے ای کا (یہ کیا) لہریا اوڑھیں گی، ایک میرا جمانا (زمانہ) تھا جی، ڈھاکہ کی ململ اور جامدانی کا جو کیہونی تک آدھی آستین کا شلوکہ ہوتا تھا، او (وہ) تو، توں (تم) لوگ دیکھتی رہ جاتیو جی (رہ جاتیں) اور پھر اس پر اچکن کا کام تو بابو جان دیتا تھا۔ جاڑے میں اونی کپڑے پر زردوزی کا کام انگرکھا کے اوپر جامہ دار یا مخمل کی خفتان ہوتی تھی۔ ہم ای سب کچھ نہ سنبھال کے رکھتے تھے۔ارے میری اماں کے گھر میں دائی نوکر، گھریلو کام کاج اور خدمت گزاری کے لیے لوگ ہوتی تھیں۔ارے ایک مغلانی تو ہر وقت کپڑا سیتی رہتی تھی اور سنوبُنی، محرم میں تو دوسرا قصہ چلتا تھا۔غم دکھاوے کو سادہ کالا، نیلا یا سبز رنگ کا کپڑا ہوتا تھا۔ارے یہی سب رنگ نے غم اور اُداسی دکھاتا ہے اور جانو ہو سبز رگ کا ہے پہنا جاتا تھا.....''

میں نے کہا، ''نہیں میں نہیں جانتی ہوں۔''

''تو سنو سبز رنگ اس لیے پہنا جاتا تھا کہ بنی عباس کے جمانے (زمانے) میں بنُی، فاطمہ کا رنگ سبز تھا۔''

میں یہ سب سُن کر بے حد لطف اندوز ہو رہی تھی اور تعجب بھی ہو رہا تھا کہ یا اللہ ان کو کس قدر باتوں کا علم ہے۔ بتولن بی کوئی معمولی شئے نہیں ہیں۔ ان کی معلومات کو سُن کر میں واقعی دنگ تھی۔

سحر کا مسکراتا چہرہ مجھے بڑا ہی پُرکشش لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی اسے کسی فرصت کے ہی وقت میں بنایا ہوگا۔ بیٹھی بیٹھی اس طرح سے مسکرا رہی تھی جیسے ایک معمولی سے لطیفے پر بھی کھلکھلا اُٹھے گی۔ شکل وصورت کی پیاری تو تھی ہی، لیکن جس سادگی سے اس نے اپنے لباس کا انتخاب کیا تھا، وہی سادگی اس کے حُسن میں چار چاند لگا رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سحر کی اماں جو ہمیشہ بڑے ہی پُروقار طریقے سے پردے کا لحاظ کرنے والی ایک شریف خاتون ہیں، انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت بھی بہت ہی محنت سے کی ہوگی۔ اسی لیے چہرے پر پاکیزگی لیے سحر بھی اتنی ہی حیادار اور ایک شرمیلی لڑکی کی صورت، اپنی ماں کے سائے میں پروان چڑھی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وہی ماں والی معصومیت صاف جھلک رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی کے چہرے پر ایک ہی طرح کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی گھنی گھنی پلکوں کو اٹھا اُٹھا کر ماں کو دیکھتی جاتی اور مسکراتی جاتی اور ماں کچھ ایسے ٹوکتی جاتیں۔

''ارے خوب جانے ہیں تو کو (تم کو) بڑی چُتر ہو، آفت کی پرکالہ ہو، چلو ہوا بہت ہوا چکلّس، دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھو۔ کا کھیال ہے (کیا خیال ہے) یہیں بیٹھی رہوگی، گھر جا کے دو مونہا چولہا جلانا ہے کی نا؟ کا آج کھانا پکاؤ گی...... کا جی منصلوہ (من وسلویٰ) اُترے گا؟''

میں سوچتی جاتی...... یا اللہ ان کی تو باتیں کہیں پر ختم ہی نہیں ہوتی ہیں۔ شاید اسی کو لچھے دار باتیں کہی جاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر بتولن بی اپنے زمانے میں اتنے ٹھاٹ باٹ سے اپنی

زندگی کے دن گزارتی تھیں، پُرانی تہذیب کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھیں تو پھر ان کے تلفظ کی خرابی آخر کس سمت سے آ کر ان کے اندر سما گئی۔ ہم ساری بہنیں مختلف زاویوں سے سوچتیں......شاید یہ ہوا ہو......شاید وہ ہوا ہو......کوئی کچھ قیاس آرائی کرتا تو کوئی کچھ، لیکن واقعی یہ بات ہم لوگوں کے لیے ایک معمّہ ہی رہی۔ جب کوئی بھی ان کے تلفظ کو درست کرنے کی کوشش کرتا تو مسکرانے لگتیں اور پھر ذرا سی دیر کے بعد کہتیں۔

''ہم پھارسی (فارسی) نانے پڑھا ہے بابو کی شہانہ بولی بولیں۔''

یہ سن کر سب لوگ ہنسنے لگتے۔

''جاؤ ہٹو جی۔ کا بدن میں لتی پتّی لگ جاؤ ہو۔ توں پھارسی (تم فارسی) پڑھے تو توں (تم) پھارسی بولو۔ ہم بابوا ایسے ہی بولیں ہیں۔ تورے (تم کو) سننا ہے تو سنو، نا تو اپنا راستہ ناپو۔''

کچھ دنوں تک تو سحر ہم لوگوں سے شرمائی شرمائی سی، کچھ خاموش خاموش سی رہی۔ پہلے روز جب وہ ہم لوگوں کے گھر آئی تھی تو میں اس کے قریب گئی اور کہا۔

''اچھا تم ہی سحر ہو۔ تمہارا نام تو بہت سنا تھا، لیکن آج ملاقات ہوئی۔''

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اُوپر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ذرا سا شرما کر اپنی پلکوں کو جھکا لیا۔ میری جانب دیکھتے ہوئے اس کی نیم باز آنکھوں نے میرے مزاج کا جائزہ لیتے ہوئے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر مجھے دوستی کی دعوت دی اور میں نے بھی مسکرا کر اس کی دعوت کو تہہ دل سے قبول کرلیا۔ اس کے بعد ایک لمبی صبر آزما خاموشی کے بعد اس کی دلکش آواز گونجی۔

''آپ اسکول جاتی ہیں؟''

میں نے جواب دیا، ''ہاں میں اسکول جاتی ہوں۔''

میں نے دل میں سوچا کہ شکر ہے کچھ تو بولی ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ یہ تو کچھ بولے گی ہی نہیں۔ وہ

میری طرف بڑی ہی حسرت سے دیکھنے لگی، جیسے اس کی آنکھیں یہ کہہ رہی تھیں کہ کاش وہ بھی اسکول جاتی۔

میں نے آخر پوچھ ہی لیا، ''سحر تم نے کیا پڑھا ہے؟''

تو بولی، ''ہم نے صرف قرآن کی تعلیم اپنے بابا سے حاصل کی تھی اور اُردو میں ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیتی ہوں۔''

مجھے اس کی زبان کافی صاف ستھری لگی جس کی مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ چلو اس لڑکی کا تلفظ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں ارادہ کرلیا کہ اگر یہ پڑھنا لکھنا چاہے گی تو میں اس کی ضرور مدد کروں گی۔ اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لوگوں کے یہاں آکر وہ بہت خوش تھی۔ اس لیے کہ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے ننھے چراغوں کو جھلملاتے ہوئے میں نے خود دیکھا تھا۔

ایک دو دن کے بعد ہی وہ میرے کمرے میں آکر میری بے ترتیب پڑی کتابوں کو شیلف پر سجانے لگی۔ میرے برش اور پینٹ کو صحیح جگہ پر بڑے ہی پیار سے رکھنے لگی۔ میں اپنی کنکھیوں سے یہ سب دیکھتی گئی اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوتی رہی اور سوچتی رہی کہ ارے یہ تو ایک اچھی خاصی اسسٹنٹ رہے گی۔

سحر ہم لوگوں سے آہستہ آہستہ کچھ اس قدر گھُل مِل گئی کہ جب بتولن بی بازار سودا لانے کے لیے جاتیں تو سحر ہم لوگوں کے ساتھ رہتی۔ میری نیلی دیواروں والے کمرے میں میری کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی۔ قصّے کہانیوں کی تو ساری کتابوں کو آہستہ آہستہ پڑھ گئی۔ ویسے اسے فلم دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں صرف دو فلمیں دیکھی تھیں۔ وحیدہ رحمان اور گرودت کی فلم ''چودھویں کا چاند'' اور دلیپ کمار اور وجینتی مالا کی ''گنگا جمنا''۔ اس نے فلمی گانوں کی بہت ساری کتابیں جمع کرلی تھیں۔ محلّے سے کوئی بھی فلم دیکھنے جاتا تو فوراً فرمائش کرتی کہ ''میرے لیے گانے کی کتاب لیتے آنا''۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلمی گانوں کی بہت ساری کتابیں اس کے پاس جمع ہوگئی تھیں جنہیں اس نے ایک ساتھ کرکے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں بائنڈنگ کرالی تھی۔ ہم لوگ اگر کبھی کسی گانے کی لائن بھول جاتے

تو فوراً سحر سے پوچھتے۔

''کیا سحر تمہاری کتاب میں فلاں گانا ہے؟''

اور سحر اس کے بعد اپنی کتاب کھول کر بڑے ہی انہماک سے گانا تلاش کرنے لگتی۔

'بنا کا گیت مالا' (ریڈیو سیلون سے نشر ہونے والا فلمی نغموں کا معروف پروگرام) کی دیوانی تھی۔ پروگرام شروع ہونے سے قبل جلدی جلدی میرے کاموں میں ہاتھ بٹا کر مجھے فرصت دلوا دیتی اور ہم لوگ گھر کے GEC ریڈیو کے پاس چپک کر بیٹھ جاتے۔ سحر، امین سیانی کی آواز اور انداز گفتگو سے مسحور ہوتی رہتی اور شروع سے آخر تک 'بنا کا گیت مالا' سن کر ہی اس کا جذب ختم ہوتا۔ واقعی 'بنا کا گیت مالا' کے توسط سے امین سیانی نے فلمی نغموں کے کروڑوں شائقین کے دلوں پر عرصے تک حکمرانی کی ہے۔

سحر اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور بے حد لاڈلی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی بچی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کی اداؤں پر دونوں جب خوش ہوتے اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے تو فرط مسرّت سے آنسو چھلک جاتے، لیکن سحر کو لاڈ میں برباد نہیں ہونے دیا۔ جب وہ بڑی ہوگئی تو زندگی کے ہر مرحلے پر تینوں ساتھ ساتھ ایک طرح سے سوچتے، تب کسی نتیجے پر پہنچتے۔ اسی لیے ان کی زندگی میں ایک ذہنی سکون اور ایک توازن ہمیشہ برقرار رہا۔

سلطان گنج، پٹنہ (بہار) سے کچھ دُوری پر واقع ایک محلّے میں ان کا ایک اوسط درجے کا بنگلہ تھا۔ بڑے ہی شان و شوکت سے ملازموں کے ساتھ ٹھاٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن ہمیشہ ایک سی قسمت سب کی کہاں رہتی ہے۔ اچانک ان کے بزنس پارٹنر نے پورا بزنس دھوکے سے، جو کالے زردے اور پیلی پتّی کا تھا، اپنے نام لکھوالیا۔

اس حادثے کے بعد بتولن بی کے شوہر بالکل خاموش ہوگئے تھے۔ اندر ہی اندر ان کے پورے اعصاب شل ہونے لگے تھے۔ ان کے بزنس پارٹنر نے وکیل کے ذریعے نہ جانے کیسا کیسا قرض دکھا کر انہیں بزنس کی ہیرا پھیری میں لپیٹ کر ان کے بنگلے کو بھی ضبط کرالیا تھا۔ ان پر مصیبتوں کا ایسا پہاڑ ٹوٹا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ بیٹی کی صورت جب جب دیکھتے، جس کے لیے انہوں نے کیا کچھ نہیں سوچا تھا، تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی اعلیٰ خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسے سب سُکھ دینا

چاہتے تھے۔ اسے ایک ایسے خاندان کے سپرد کرنا چاہتے تھے جہاں اسے محبت اور عزت ملے، لیکن اب تو روزمرّہ کے اخراجات سے انہیں نپٹنا تھا جس کی کوئی بھی صورت انہیں نظر نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ ایک گھر تھا جسے انہیں بیچنا پڑا اور اسی سے گھر کے اخراجات چلنے لگے۔ زیادہ تر اپنے دل کی پریشانی کو دل ہی میں رکھتے، لیکن آخر کب تک؟ ماں بیٹی دونوں ہی کو پتہ چل گیا کہ وہ کون سی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ پھر انہیں بھی ساری تفصیل دونوں ماں بیٹی کو بتانی پڑی اور بتاتے کیسے نہیں، آخر بھگتنا تو ان ماں بیٹی ہی کو تھا۔ بتولن بی تو سنتے ہی زور زور سے رونے لگیں۔ سحر تو جیسے سہم سی گئی اور خود کو حالات کے دھارے میں چھوڑ دیا اور کرتی بھی تو کیا کرتی۔ ماں اور باپ کے سہانے منصوبوں کو یاد کر کے، جو اس نے اپنے کمرے کی کواڑ کی اوٹ سے سنے تھے اور اشکبار ہو جاتی۔ وہ خدا کی بنائی ہوئی اس تقدیر کے بارے میں سوچنے لگتی۔ نماز کے بعد آسمان کو دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعائیں مانگتی جاتی اور آنسوؤں کو اپنے دوپٹے میں چھپا لیتی۔

آخر کار انہوں نے ایک کرائے کا گھر لے لیا جس میں چھوٹے چھوٹے چار کمرے تھے اور ایک بوسیدہ چھوٹا سا آنگن۔ جب ان کی مالی حالت نے دَم توڑنا شروع کر دیا تو اپنے پرائے بھی ان کے پاس سے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ کچھ دنوں تک تو جیسے تیسے زندگی کٹی، لیکن دل و دماغ کی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اب زمانے کے سرد و گرم چکھنے کی صلاحیت ان میں بچی ہی نہیں تھی۔ اس غم کو برداشت کرتے کرتے وہ اس قدر تھک گئے کہ بیوی بیٹی کو اس بھری دُنیا میں تن تنہا چھوڑ کر اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

قدرت نے انہیں خواب دیکھنے کی ایسی سزا دی تھی کہ جیتے جی ہی وہ ایک بھنور میں پھنس گئے تھے جو انہیں نہ ڈُوبنے دیتا اور نہ ہی اُبھرنے۔ بیٹی کی معصوم صورت کی طرف اپنی نظریں اُٹھاتے تو ان کا دل پاش پاش ہو جاتا۔ بیوی کی رات دن کی گریہ وزاری اور آہ و بکا سن کر وہ اور بھی پریشان ہو جاتے۔

سب سے بڑی مصیبت ان کے لیے یہ تھی کہ وہ کٹاری ٹولہ کے اس تنگ و تاریک گھر میں آ کر ایسا

محسوس کرتے تھے جیسے کوئی ہر پل ان کا دَم نکال رہا ہے۔ اسی قسم کے نہ جانے کتنے ہی تلخ وترش حقائق کا سامنا کرتے کرتے بے دَم ہو گئے۔ پھر اسی میں بہتری سمجھی کہ اب اس زندگی کی اٹھ پٹک سے چھٹکارا ہی پالیں اور اسی کی دُعائیں کرتے رہے کہ اے میرے معبود مجھے اُٹھا لے۔ سوچتے تو یہی تھے کہ وہ ناخوش گوار حالات کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور پورے صبر وسکون کے ساتھ زندگی کے بچے ہوئے دن بھی گزار دیں گے، لیکن اپنے دل پر کس کا اختیار رہا ہے اور انسان کا اپنا سوچا ہوا کب پورا ہوتا ہے۔ بالآخر ہوتا ہے وہی جو اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ آخر کار انہوں نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیا اور آہستہ آہستہ اسی بوسیدہ گھر میں ڈُوبتے گئے اور ڈُوبتے ہی گئے۔ اور ایک باب جیسے ختم ہو گیا۔ اپنے زرد پیکر کو اپنے ہی کاندھے پر اُٹھا کر اپنی بے بسی اور تشنگی سے عاجز وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو اتنی بڑی دُنیا میں بے اماں اور بے مکاں چھوڑ کر جاتے وقت ان کے دماغ کی ایک ایک رگیں تن گئیں۔ وہ یہی سوچتے رہے کہ ان کی پھول جیسی بیٹی نہ جانے اپنی شاخ سے ٹوٹ کر کیسی کیسی اذیتیں اُٹھائے گی، جانے کس کس در کی خاک چھانے گی، لیکن وہ بے بس تھے۔

بیٹی کی کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سن کر بتول بی آنسوؤں سے تر بہ تر اور تھکن سے چُور، نہ جانے کتنے دنوں تک اپنے اس چھوٹے سے کھٹولے پر پڑی رہیں۔ سحر الگ باپ کے غم میں کئی دنوں تک اپنے کمرے میں ہی آہ زاری کرتی رہی۔ پھر ماں کی ایسی گئی گزری حالت دیکھ کر خود میں طاقت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی اور ماں کے اِرد گرد ہی منڈلاتی رہی۔

”اماں، اُٹھو نا اماں۔ تم اگر اتنا دُکھی رہو گی تو میں خود کو کس طرح سنبھالوں گی۔“

باپ کی محفوظ پناہوں سے محروم ہو کر سحر کے سوچنے سمجھنے کی راہیں کچھ بدل گئی تھیں۔ اسے اپنے باپ اور ماں پر ناز تھا، لیکن اب بتولن بی کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس نے سوچا کہ اگر میں بھی اسی قدر نڈھال رہی تو میری ماں کا کیا ہوگا، مجھے اماں کو سنبھالنا ہے اس لیے کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں

گی۔اس کے اندر کی تنہا لڑکی اپنے کانپتے ہونٹوں پر ماں کو بہلانے کے لیے مسکراہٹ سجانے لگی، گرچہ اس کے دل کا جو حال ہو رہا تھا صرف وہ جانتی تھی یا اس کا خدا۔ وہ رات رات بھر اپنی کھلی آنکھوں سے اپنی آنے والی زندگی کا اندازہ لگاتی رہتی۔ آنکھوں سے نیند کا ناتا ٹوٹ چکا تھا، لیکن پھر آہستہ آہستہ بتولن بی میں جیسے دَم خم آنے لگا۔ سحر کو بھی ان سے طاقت ملتی گئی۔ یہی تو خداوند تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ایک دولت ہے جو اگر انسان کو عطا نہیں ہوتی، یعنی صبر کی دولت، تو انسان بے حال ہو جاتا۔ دونوں ماں بیٹی اپنے کاندھے پر اس غم کے بوجھ کو اُٹھا کر چلنے کی جیسے عادی سی ہو گئیں، یعنی بغیر کسی مرد کی سرپرستی کے زندگی گزارنے کا ہنر انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ گرچہ قدم قدم پر بتولن بی کو شوہر کی اور سحر کو باپ کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ ایک گھنا چھتنار درخت حالات کی آندھی میں زمیں بوس ہو چکا تھا۔ اب ان کے سر برہنہ تھے اور وقت کی دھوپ کڑی، لیکن جس خدائے بزرگ و برتر نے یہ حالات پیدا کیے تھے اسی نے انہیں جینے کا حوصلہ اور صبر کی قوّت بھی عطا کر دی تھی۔

بتولن بی انہیں دنوں سے ڈائن، جادو اور ٹونا کو زیادہ ہی ماننے لگیں۔ کوئی بھی ان کو غور سے دیکھتا تو فوراً منھ دوسری طرف کر لیتیں اور کہتیں۔

’’ہونہہ، ارے بھائی، ہم کو اتنا غور سے کا (کیا) دیکھو ہو۔ اپنا کام کرو نا بھائی۔ نہ جانے باہر لوگ کا کا کریں ہیں۔‘‘

کسی دن ایسی خبر لاتیں۔

’’ارے صاحب!‘‘ امّی کو مخاطب کر کے کہتیں، ’’او (وہ) جو سامنے والا کوٹھیا ہے نا، اس میں جو کالی ایسی بساطن ڈائن رہتی تھی، او (وہ) راتے (رات) مر گئی۔‘‘

اور پھر خوب مسکرانے لگیں۔

ہم لوگ جب ٹوکتے، ’’ہائے بتولن بی، اس کی موت ہوئی ہے اور آپ خوش ہو رہی ہیں۔‘‘

تو کہتیں، ''نا بابو، خوش نا ہو رہے ہیں۔ سوچیں ہیں کہ اللہ میاں کے یہاں نپٹتی (سوال و جواب) ہوں گی۔''

کسی بھی بات کو گرنے نہیں دیتیں۔ ہر بات کا جواب ان کے پاس ہر وقت موجود رہتا۔ بتولن بی بھی نانی امّاں والی کہانی سے تھوڑا سا مختلف انداز میں اپنی یہ کہانی سناتیں۔

''سنو، ایک تھیں مائے (ماں) اور ایک ان کے چراگ (چراغ، یعنی ان کا بیٹا تھا)

لال اوڑھنی ٹٹو ہی زار

کے کی خالہ چاول چھاٹے مائے

ہائے تیری بٹیا نے بابو

ٹھٹھا کریں اماں (مذاق کریں امّاں؟)

جیتے رہو برخوردار...... ہاں ہاں ٹھٹھا کرو بیٹا

ساگ میں سیروآ (شوربا)، اے خالہ

دلہن بولیں...... جورو (بیوی) کو خالہ رے ماموں

بیٹا بولے...... بھلّے سے کہہ دیا رے نانی

یہی تھا مذاق

کٹاری ٹولے کا یہ مکان جہاں سحر اور اس کی امّاں رہتی تھیں، وہ لبِ سڑک نکڑ پر واقع تھا۔ گھر کے دروازے پر ایک بہت ہی دبیز سا ٹاٹ کا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا دالان ڈیوڑھی نما جس پر دو لکڑی کے ستون کھڑے تھے اور وہیں ایک ستون سے بتولن بی کی بکری رسّی سے بندھی ہوتی تھی۔ دوسرے پائے سے چنبیلی کی بیل چڑھی رہتی تھی۔ جس کی نچلی شاخوں کی پتّیوں کو بکری نے چبا چبا کر ختم کر دیا تھا مگر آسمان کی طرف اُٹھتی ہوئی شاخوں میں پتّیوں سے زیادہ پھول کھلے رہتے۔ دالان سے

متصل بہت چھوٹا سا آنگن تھا جس میں لال اینٹیں بچھی تھیں۔ برسات کے زمانے میں ان اینٹوں کے درمیان ہری ہری چھوٹی چھوٹی گھاس اُگ جاتی تھی۔ سامنے کی دیوار کے اُوپری حصے کا پلاسٹر غائب تھا جہاں پر مٹی سے لپائی کی ہوئی تھی۔ نچلے حصے کا کچھ پلاسٹر قائم تھا۔ آنگن کے ایک کونے میں چھوٹا سا چبوترہ بھی تھا جس پر چاپانل لگا ہوا تھا۔ اسی سے ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر دومنھ والا چولہا بتولن بی نے بنوا رکھا تھا جہاں پر وہ اور سحر مل کر چولہے میں لکڑی جلا جلا کر کھانا پکا تیں۔ وہیں پر بتولن بی کا چھوٹا سا کھٹولہ تھا جس پر ایک پچکا ہوا تکیہ، پاندان، تسبیح اور جائے نماز رکھی رہتی۔ کھٹولہ اتنا چھوٹا کہ کوئی بڑے قد کا آدمی کبھی نہ بیٹھ سکتا اور نہ لیٹ سکتا۔ چولہے کے پاس ہی مچیے پر بیٹھی بتولن بی خود کو ذرا سا دائیں طرف موڑ دیتیں تو سل اور بٹہ تک پہنچ جاتیں اور بائیں طرف مڑ کر آنگن کی کھلی نالی میں پان کی پرکی پھینک دیتیں۔ جسم میں اتنی تو طاقت تھی نہیں کہ پوری طاقت لگا کر مسالہ پیستیں لیکن ہاں کبھی کبھی اپنے کمزور ہاتھوں سے مسالے کو کسی طرح کچل دیتیں۔ عام طور پر روزمرہ کے استعمال کے لیے سحر ہی مسالہ پیستی تھی۔ وہ اپنی نحیف اور کمزور ماں کو مشکل کاموں سے بچانے کے لیے کوشاں رہتی۔ بتولن بی کھٹولے سے ہی ہاتھ بڑھا کر اپنا پاندان اُٹھا لیتیں اور پھر اسے اپنے بہت قریب چولہے کے پاس لے آتیں۔ اپنی کتھے چونے سے رنگی رنگائی اُنگلیوں سے چاندی کا پاندان بہت ہی منہمک ہو کر کھولتیں جیسے کہ نہ جانے کتنا بڑا خزانہ کھول رہی ہوں اور گنگنا کر، اچھے موڈ میں رہیں تو پان کی چھوٹی چھوٹی گلوریاں لگاتی جاتیں اور ساتھ ساتھ اپنے منھ میں بھی ڈالتی جاتیں۔ منھ میں پان کی گلوریوں کے رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی سحر سے باتیں کرتیں۔ زیادہ تر سحر ان کی باتوں کو سمجھ جاتی تھی۔ اگر کبھی یہ بول گئی کہ:

''ہائے کاہے اماں، آج تم کو کیا ہوا۔ کیا کہو ہو، کچھ سمجھ میں نا آرہا ہے۔''

یعنی اگر دوبارہ پوچھ لیا تو فوراً منھ سے پان کی گلوریوں کو وہیں نالی میں پھینک دیتیں اور کہنے لگتیں۔

''یا اللہ، ذرا سا سکون سے پان بھی نا کھائے دو ہو بابو۔ ہائے سمجھو کا ہے نا ہو۔ میرا پان کھانا بہت

ضروری ہے۔ نا تو منھ کھٹا کھٹا لگے ہے بابو۔''

اپنی جوانی کو بتولن بی اگر کبھی یاد کرنے لگتیں تو مجھے واقعی بے حد لطف آتا تھا۔ میں بہت ہی دھیان سے ان کی باتیں سننے لگتی تھی۔ ابھی ان کی باتیں شروع ہوئی تھیں، کچھ اس طرح کہ:

''ارے ایک میرا جمانا (زمانہ) تھا...... ہم اپنی جوانی کا بات کا بتاویں......''

بس ان کے لہجے کی رُت بدل جاتی۔ چہرے پر ایک خاص نکھار آ جاتا۔ زیرِ لب مسکرانے لگتیں۔ نظریں نیچی ہو جاتیں اور کافی دیر تک صرف ہلکے ہلکے مسکرائے جاتیں۔ ان لمحوں میں چپ رہ کر بھی ایسا لگتا کہ سب کچھ کہے جا رہی ہیں اور میں پتہ نہیں کس طرح ان کے لہجے کے پس منظر کو سمجھ لیتی تھی۔ ویسے جوانی کے دل لبھا دینے والے کئی قصے وہ پہلے بھی کئی بار اپنی زبان سے اَدا کر چکی تھیں۔

''بابو بڑا سکھ اُٹھایا۔ کوئی فکر نا تردّد۔ بس کھایا پیا موج کیا۔ اِدھر سے اُچھلے اُدھر کودے۔ اُدھر سے چھلانگ لگایا تو ای پار آ گئے''۔ پھر بہت ہی آہستہ سے قریب قریب آنکھوں کے اشارے سے ہی بولنے لگیں کہ کوئی سن نہ لے، ''اور سنو سحر ہوئے کو تھی اور اوہی (وہی) حالت میں چہار دیواری پھلانگ جاتے تھے۔ ارے کانا (کیانہ) کیا۔ صورت شکل کا سوچو ہو، ایسا ہی تھا نا، چہرہ تو ہر وقت چمکتا رہتا تھا۔ اب نا بتولن کھاک (خاک) ہوئی ہیں۔ سنو سنو، قینچی نا ملی تو کا ہے کا غم، دانت ہی سے پورا کا پورا جمپر کا مونڈھا تراش لیا''۔ پھر زور دے کر بولتیں ''تراش لیا...... تراش لیا۔ پہاڑ ڈھا دیتے تھے بابو۔ مگر ای کبھی نا بولے کی بور ہو رہے ہیں۔ ای کا جانے، ای بار کا ہوئے ہے۔ پہلے سحر 'بور' نا جانتی تھی۔ اب جب سے تورے گھر میں آنا جانا ہوا، جب دیکھو 'بور' بولے جا رہی ہے...... 'بور' بولے جا رہی ہے۔ ارے بھائی گیت گاؤ، ڈھول بجاؤ، ہنسو بولو، جھومر گاؤ۔ ایک جھومر ہم گاتے تھے۔ سنو گی؟''

میں بہت خوش ہو کر کہتی۔ ''ہاں بتولن بی۔ سنائیے نا۔''

کہتیں، ''لو سنو!

ہری رکابی گرم جلابی اے ہی ناشتہ سب چھوکڑین کا ہوگا
چنّی کی روٹی اور بینگن کا بھرتہ، اے ہی ناشتہ بوڑھین کا ہوگا
ہاتھوں میں گھڑی، آنکھوں پہ چشمہ اے ہی لونڈا سب چھوکڑین کا ہوگا
ہاتھوں میں لاٹھی، منہ کا پو پلا اے ہی بڈھا سب بوڑھین کا ہوگا''

پھر کبھی بات کرتے کرتے بالکل سنجیدہ ہو جاتیں۔ غور سے سحر کے چہرے کو تکتے ہوئے کہتیں۔

''سنو سحر! ہنسو بولو، ٹھٹھا کرو، سب کرو، مگر ہمیشہ اللہ رسول ﷺ کی بات کو اپنے دل میں بسائے رکھو۔ دیکھو بابو! میرے پیارے نبی ﷺ یہ ضرور بولے ہیں کہ مرد کو بیوی کے ساتھ اچھا اخلاق برتو، پیار محبت سے دل جیتو، مگر بابو عورت کو بولے ہیں کہ اللہ میاں قیامت کے دن ناشکری عورت کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نا دیکھیں گے۔ سن لو بابو، آج تو میرے گھر میں ہو، کل پرائی ہو جاؤ گی۔ بابو ای سب تورے جانے کا ہے۔ شوہر کی خدمت کرو گی بیٹا۔ اپنے جان پر دُکھ جھیل لو مگر شوہر کو آرام پہنچاؤ گی۔ بابو ای دُنیا میں کرو گی، اس کا پھل ہواں پاؤ گی۔ اگر شوہر کا دل جیتو گی تو تورا ہی بھلا ہوگا۔ دیکھو بیٹا، دھیان سے سنو بیٹا......''

سحر نظریں اُٹھا اُٹھا کر ماں کی طرف دیکھتی اور مسکراتی جاتی۔ بتولن بی پھر سے تقریر کے موڈ میں آ جاتیں۔

''سنو بابو، دھیان سے سنو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے ہاتھ سے نبی ﷺ کا کپڑا دھوتیں، سر میں تیل لگاتیں، کنگھا کرتیں، خوشبو لگاتیں، اوہی تورے بھی کرنا ہے۔ اگر توں پانچ وقت کی نماز پڑھو گی اور شوہر کا بات مانو گی تو جنت میں جو دروازے سے چاہو گی، اوہی سے چلی جاؤ گی بابو۔ اور جو کہ کڑھتی رہیو تو، توں جانوں اور تمرا اللہ جانے۔ میرا جو کام تھا بابو تورے سب بتاوے کا، او بتا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔''

پھر سحر جواب دیتی، ''سن لیا اماں، سن لیا۔''

دائیں اور بائیں طرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بائیں طرف والے کمروں میں دریچیاں

تھیں اور باقی کمروں میں تو دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا تھا۔ جس کمرے میں بتولن بی سوتی تھیں وہ نہایت تاریک تھا۔ ویسے زیادہ تر تو وہ دالان اور آنگن میں ہی اپنا وقت گزارتی تھیں۔ صرف جاڑے کے موسم میں ہی وہ کمرے میں رات گزارتی تھیں۔ بائیں طرف والے کمروں میں دریچیاں تھیں۔ پہلے کمرے کو سحر نے بیٹھک بنایا تھا جہاں ایک تخت اور کرسیاں تھیں۔ اس کے ساتھ والا کمرہ سحر کا کمرہ تھا جہاں سحر کا ایک بستر تھا اور ایک چھوٹی سی چوکی جس پر سحر نماز پڑھتی تھی۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا آئینہ لٹکا ہوا تھا اور اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا طاق تھا جہاں وہ کنگھی اور سر کا تیل رکھتی تھی۔ ایک دن جب میں ان کے گھر گئی تو دیکھا کہ کچھ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ میں نے سحر کو ٹوکا تو بتولن بی یک بیک میں اور تو والے لہجے میں آگئیں اور بولیں...... ''میں رانی تم رانی کون ڈالے سر پر پانی۔''

مغرب کے بعد بتولن بی مچیا پہ بیٹھ کر آنگن کے دومونہے چولہے پر کھانا پکانے کی شروعات کرتیں تو سحر کو بھی اپنے پاس مدد کے لیے بلاتیں۔ چولہے کی جلتی ہوئی لکڑی کی روشنی میں سحر سے اپنے دل کی باتیں کرتیں۔ اللہ اور رسول ﷺ کی باتوں کی روشنی میں نہ جانے کتنی سبق آموز کہانیاں سناتیں۔ نہ جانے کون کون سی درگاہوں پر جا کر انہوں نے اپنے خدا سے سحر کو مانگا تھا۔ خدا نے بھی ان کی فریاد سن لی تھی۔ وہ یہی سوچتی تھیں کہ اگر خدا نے مجھے اتنا حسین تحفہ دیا ہے تو مجھے بھی سحر کو اچھی سے اچھی تربیت دینی ہے۔ اور واقعی انہوں نے بیٹی کو بہت اچھی تربیت دی بھی تھی۔ کچھ تو قدرتی طور پر سحر بھی نرم مزاج تھی اور کچھ ماں کی عمدہ تربیت کا اثر تھا کہ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ محلہ جہاں پر بتولن بی نے کرائے کا مکان لیا تھا، وہ ایک ایسی جگہ تھی جو مختلف قسم کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ محلہ ایک مخلوط محلہ تھا جہاں ہر ذات اور ہر فرقے کے لوگ رہتے تھے۔ سحر کے گھر کے آس پاس زیادہ تر غریب اور کچھ اوسط درجے کے لوگ رہتے تھے۔ کچھ گلیاں اپنے قدیم نام سے ہی مقامی طور پر پہچانی جاتی تھیں۔ یہ گلی، کٹاری ٹولی والی گلی کہلاتی تھی۔ ان لال اینٹوں سے بچھی ہوئی سڑک پر عموماً لوگ پیدل چلتے تھے۔ امراء اور رؤسا گاڑی، رکشے، ٹم ٹم، فٹن، بگھیاں یا تانگے پر چلتے تھے، لیکن غریب لوگ زیادہ تر پیدل چلتے تھے۔

سبزی کے ہرے بھرے ٹھیلے، پھیری والوں کی گاتی ہوئی آوازوں کے ساتھ سائیکل کی گھنٹی اور 'ہش ہاش' سے اس علاقے کا ایک خاص سماں بنتا تھا۔ قلفی بیچنے والے اپنے بڑے سے فلاسک میں قلفیوں کو رکھ کر لیے پھرتے اور کہتے رہتے...... "لے لو قلفی، لے لو...... لے لو محبت میں گھلی جا رہی ہے۔"

قلفی والا قریب قریب روز ہی آتا۔ کبھی کبھی جب بتولن بی اپنے گھر سے نکلنے لگتیں تو کہتا، "کا بتولن بی، قلفی نا کھاؤ گی؟"

بتولن بی جواب دیتیں، "گھل رہی ہے تو گھلنے دے۔"

اوران کا جواب سن کر وہ مسکراتا ہوا آگے نکل جاتا۔

آم اور امرود بیچنے والے بھی اپنی ایسی سُریلی آواز میں الاپ لگاتے کہ گلی اور بھی پُر رونق ہو جاتی۔ بساطن کنگھی چوٹی ربن چٹلا کو ٹوکری میں سجا کر سر پر رکھ کر مسکراتی ہوئی آہستہ آہستہ گھروں کے سامنے سے گزرتی۔ اگر کسی کے گھر کے اندر داخل ہو گئی تو پھر گھنٹہ بھر تو گزر ہی جاتا اور پھر ہر گھر سے خواتین نکل کر اسی آنگن میں آجاتیں جہاں وہ اپنے سامان کو کھول کھول کر دکھاتی جاتی اور اپنے سامان کی تعریف کرتی جاتی۔ اسی گلی میں کسی کی بکری بندھی بیٹھی کیوری کرتی رہتی۔ مرغیاں اور بطخیں اپنے آپ کو لچکا لچکا کر دانہ چگنے کے فراق میں اِدھر سے اُدھر گھومتی پھرتیں۔ سڑک پر لوگوں کی مرغیاں رنگ برنگ ٹاپوں میں مچلتی رہتیں اور اندر ہی اندر ٹاپے میں گول گول گھومتی رہتیں۔ ان ساری چیزوں کے علاوہ بیچ سڑک پر کچھ لڑکے ننگے اور دھول میں اَٹے پاؤں سے گلی ڈنڈا اور شیشے کی گولیاں بھی کھیلتے۔

بتولن بی اکثر ایک ضعیف شخص کو روک کر اس سے لال گرم تیل اپنے پاؤں کے درد کے لیے ضرور خریدتیں۔ وہ شخص ہمیشہ دوپلّی ٹوپی پہنے رہتا اور آنکھوں میں بڑی فراوانی سے سرمہ لگائے رہتا۔ ہم لوگ ہمیشہ بتولن بی سے کہتے کہ آنکھ میں سرمہ یا کاجل نہیں لگانا چاہیے، تو کہتیں:

''ای کا کہو ہو بابو، کی سرمہ کاجل خراب چیز ہے آنکھ کے واسطے۔ دیکھو جمن شاہ کبھی اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتا اگر خراب ہوتا...... کیسی او کی چک چک آنکھ ہے۔ تورے لوگ (تم لوگ) کی بات ہم نا سنیں گے۔''

اس شخص کی گردن میں ایک لکڑی کا ٹرے ڈور سے بندھا ہوا لٹکتا رہتا جس میں چھوٹی شیشیاں بجی رہتیں اور وہ زور زور سے ایک آواز بلند کرتا:

''پیڑے کا دُشمن لال گرم تیل......''

ایک گہما گہمی رہتی، ایک ہنگامہ رہتا اور اسی شور شرابے سے گزرتی ہوئی بتولن بی اور سحر ہم لوگوں

کے گھر آتی جاتیں۔

بتولن بی نے اس مصیبت میں بھی بیٹی کو کہیں کام نہیں کرنے دیا، لیکن خود اس عمر میں بھی مجبوراً گھر سے نکل کر سودا سلف لانے لگیں اور جب انہوں نے کام کرنے کا پورا ارادہ کر لیا تو اتفاق سے پہلا گھر ہم لوگوں کا ہی ملا۔ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش رہتیں، کہتیں:

"آپ لوگوں کے پاس آویں (آتے) ہیں نا صاحب تو بڑا ستار (آرام) لگے ہے۔ ارے صاحب برقعہ ورقعہ سب اُتر گیا۔ اب تو یہی چادر ہی اوڑھ کر نکل جا ہیں...... ارے ناچے اُٹھے تو گھونگھٹ کیسا۔"

سحر کی امّاں اپنے دُشمن کو دن رات کوستیں۔ اپنے شوہر کو سرکار کہتیں۔ جب بھی باتوں باتوں میں میاں کا کوئی تذکرہ آجاتا تو اشکبار ہو جاتیں اور اپنے آنچل سے آنسوؤں کو پوچھتی جاتیں اور کہتی جاتیں:

"ہائے سرکار کو حرامی کے پلّے نے ایسی ماردی صاحب، کی پھر تو بے چارے اٹھیے (اُٹھ ہی) نہ سکے۔"

اپنے دُشمنوں کو کوستے وقت ان کا لب ولہجہ بالکل ہی بدل جاتا۔ الفاظ سے ایسا غم وغصّہ اور حقارت وناراضگی کا اظہار ہوتا کہ گھر کی دوسری خادمائیں بتولن بی کے اِردگرد آکر کھڑی ہو جاتیں اور ہنکارے بھر بھر کران کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگتیں۔ بتولن بی اپنے مخصوص انداز میں کہتی جاتیں:

"ارے اس منھ جلے کے لیے جو آہ نکلے ہے صاحب، او (وہ) خالی نا جائے گی۔ کوڑھی کے اٹھارہ بیر (وقعت کھودے گا) ہوگا۔ ارے بتاشے کے جیسا گھل جیہے (جائے گا) صاحب!"

امّی انہیں سمجھاتیں، "بتولن بی۔ ارے بھئی، اب معاف بھی کر دیجیے۔ معاف کر دیجیے گا تو آپ کو بھی ثواب ہوگا۔"

اپنے شوہر کو دن بھر میں کئی بار یاد کرتیں۔ انہوں نے ساری زندگی اپنے مثالی کردار کی وجہ سے

اپنے شوہر کے دل میں اپنے وجود کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر فریفتہ رہتے تھے، لیکن انہیں یہ دُکھ بھی دیکھنا تھا۔ ان کے پاس جو زیور بچے تھے، ان میں سے اپنا بھاری کنگن بیچ کر انہوں نے اپنے سرکار کا بہت ہی خوب صورت مقبرہ بنوادیا تھا۔ انہیں تو اپنا کنگن سُنار کو سپرد کرتے وقت ذرا بھی دُکھ نہیں ہوا تھا۔

''ارے ای کنگنا کا ہے بابو، اپنے سرکار کے لیے ای جان حاجر (حاضر) ہے۔ میرے سرکار میرے لیے کا تھے، ای کوئی نا جانے ہے بابو!''

پھر خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ بتولن بی کی باتیں عجب نرالی ہوتی تھیں۔ جب بھی وہ ہم لوگوں کے آنگن میں آتیں اور کچھ بیان کرنا شروع کرتیں تو میں ہمیشہ ہی بڑے غور سے ان کی باتوں کو سنتی۔ ایک دن جب وہ آئیں تو مجھے بے حدافسردہ لگیں۔ میں نے پوچھا:

''کیوں آج آپ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ارے کا کہیں بُنّی، ای (یہ) اپنا کسمت (قسمت)''

''کیا ہوا بتولن بی، کچھ بتایئے تو۔''

''ارے کا (کیا) بتاویں بُنّی، لو سنو کا (کیا) ہوا۔ ارے بُنّی ای (اس) جان کی ہڈی بڑی کمجور (کمزور) ہوگئی ہے بابو۔ سو، روز کا (کیا) کرتے تھے کی لوٹا میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی تھوڑا سا کھلے آسمان تلے رکھ دیتے تھے کی سبنم (شبنم) کی بونداو (اُس) میں گریہے (گرے گی) تو نہار منھ اوہی (وہی) پانی پیئیں گے مگر کا (کیا) بتاویں، اوہی کسمت کھراب (وہی قسمت خراب)۔ سو، جو بُنّی، اب او بھی نصیب نا ہے۔''

میں نے پوچھا، ''تو کیوں نہیں، اب آپ وہ ٹھنڈا پانی پی رہی ہیں۔ وہ تو آپ کو ضرور پینا چاہیے، اگر آپ کو فائدہ تھا تو۔''

تو بولیں، ''ہائے بُنّی، سنا کی (کہ) دور دیس (امریکہ کی جانب اشارہ) میں ای (یہ) منہ جھونسا سب ہوائی جہاج (ہوائی جہاز) لے کے چاند پر چلا گیا۔

''ہائے بتولن بی، تو کیا ہوا، اگر وہ چاند پر چلا گیا تو آپ کے اس ٹھنڈے پانی سے اس کا کیا تعلق؟''
بولیں، ''بُنّی کی بات! اور او جو ہواں (وہاں) سے موتیہیں (پیشاب کریں گے) تو او (وہ) کہاں جئیہے (جائے گا)۔ ارے او ہی پانی میں ہی نہ گریہے جی (گرے گا) اور توں کہو ہو کہ او ہی پانی ہم پی جائیں''۔ تھوڑا ٹھہر کر بولیں۔

''دیکھو بُنّی، ای جمانا (زمانہ) اب بہت کھراب آ رہا ہے۔ اب بہت دھاندلی چلے گا۔ توں (تم) کچھ نا جانو ہو بابو۔''

ہم ساری بہنیں نہ جانے کتنے دنوں تک اس واقعے کو یاد کر کے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ بتولن بی کی سادگی کا بھی واقعی کوئی جواب نہیں تھا۔

بتولن بی کے کسی بھی رشتہ دار سے میں کبھی نہیں ملی، سوائے فہیمن بی کے جو بتولن بی کی چھوٹی بہن اور سحر کی خالہ تھیں۔ وہ ان دونوں ماں بیٹی سے ملنے کبھی کبھی آ جاتیں۔ دھان پان سی فہیمن بی بھی بہن کی طرح پان کھانے کی شوقین تھیں۔ وہ مجسم پان اور عطر کی ملی جلی خوشبوؤں میں بسی رہتی تھیں۔ برقع بھی پہنتیں اور رکشے میں پردہ بھی لگواتیں۔ بہن کی پریشانی کو سن کر لکھنؤ سے فوراً ہی آ گئیں۔ آتے ہی بہن سے کہنے لگیں۔

''ہائے بوبو (باجی) کیسی دُبلی ہو گئی ہو۔ کیسی گھل گئی ہو جی۔ تو کو (تم کو) کا ہوا بوبو۔ تو کو (تم کو) کبھی نہ پہچانتے۔ ہائے تو کو کان کی بالی سے پہچانا۔''

شوہر کے مرنے کے بعد بتولن بی نے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑوں سے بھی پرہیز

کرنے لگیں مگر امّاں کی پہنائی ہوئی بالی پتہ کو کان سے کبھی نہیں اُتارا۔ وہ تو بتولن بی خود ہی جانیں کہ اس کے پیچھے کیا راز تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور خوب خوب پھوٹ کر رونے لگیں۔ جب دل کی بھڑاس نکل گئی، دل تھوڑا ہلکا ہوا تو دونوں ایک دوسرے کو بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہیں۔

''اجی فہیمن، ای بڑھاپے میں کا اتنا پردہ کرو ہو جی۔ تورے کون دیکھے گا او نجر سے (اس نظر سے)۔ چلو ہٹو۔ ہم تو بابوا ہی ایک موٹکی (دبیز) چادر ڈال لے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔''

بہن کا بھی بات کرنے کا انداز بالکل بتولن بی جیسا ہی تھا لیکن تھوڑا چٹ پٹا کم تھا۔ دونوں جب آپس میں باتیں کرتیں تو وہ سماں دیکھنے کے لائق رہتا تھا۔ ان لوگوں کا رونا دھونا جب ختم ہوا تو بتولن بی نے آہستہ سے پوچھا۔

''کا جی فہیمن، بیٹا کا بیاہ ٹھیک کر لیو (کر لیا) جی۔ آخر توں اس کی شادی کب کروگی؟''

بہن نے جواب دیا، ''کا بابوا س چھوکرے کا رشتہ کرنا اتنا آسان ہے جی۔ ابھی ابھی ایک بڑے اچھے گھر سے رشتہ آیا، ارے او لوگ تو پیسے سے اندھے ہو رہے ہیں''۔ اپنے کالے برقعے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بتولن بی کی نظروں کے سامنے لے آئیں اور کہنے لگیں، ''بابو صاحب کو بتا دیا کہ دیکھ لڑکی کا رنگ ایسا ہے (یعنی کالے برقعے جیسا)، کرے گا بیا۔ اگر جو کہ کرلے گا تو قسمت سنور جائے گی۔''

بتولن بی نے آواز لگائی، ''اجی تو او بد عقل کا بولا فہیمن۔''

فہیمن بولیں، ''ہائے او تو کچھ نا بولا اور خالی تاکے لگا۔ ارے ہم کو سحر اتنی اچھی لگے ہے...... کہا، بہت کہا کہ سحر کو اپنے گھر لے آ، بسالے اپنا گھر۔ مگر نا، او بھی نا۔ کزن سے نہیں، کزن سے نہیں، کہے لگا۔''

''اجی فہیمن!'' بتولن بی پوچھنے لگیں، ''کزن کا ہوئے ہے؟ او ہی فرنگی والی بولی۔''

''ہائے نا جانو ہو۔ چچیرا، ممیرا، خلیرا بھائی بہن کو کزن کہا جا ہے۔ ہاں ہاں ٹھیکے بولی او ہی فرنگی

والی بولی۔"

بتولن بی بے چاری خاموش ہوگئیں۔ کرتیں بھی کیا، ان کے دل میں یہ ایک بہت بڑی آس تھی کہ بہن سحر کو لے جائے گی۔ اپنے گھر میں رانی بنا کر رکھے گی۔ کیسے کیسے خواب دیکھے، کیسی کیسی پلاننگ بنائی کہ..... ارے سحر فہیمن کے پاس چلی جا گی تو ہم اے ہی کوٹھری میں کاہے کو پڑے رہیں گے۔ اوہی (اسی) کے ساتھ چلے جائیں گے۔ دونوں تو اپنا ہی بچّہ ہے۔ فہیمن بی کی بات سن کر بتولن بی سکتے میں آ گئیں۔ ان کے چہرے پر یاسیت کے بادل چھا گئے۔ فہیمن بی بہن کی پریشانی کو خوب سمجھ رہی تھیں لیکن بے اختیار تھیں۔ بہن کی دلجوئی کرتے ہوئے بولیں۔

"ارے چھوڑو نا بوبو۔ کا اے ہی چھوکرا میں چار چاند لگا ہوا ہے۔ ہم اپنی سحر کا ایسا دلہا کھوجیں گے کہ دُنیا دیکھتی رہ جائے گی۔"

تھوڑی سی خاموشی کے بعد بتولن بی پھر نئے سرے سے شروع ہوگئیں۔

"دیکھو فہیمن! میرے بھی جی میں یہی تھا کہ سحر کو ہم تمرے ہی گھر میں بہو بنا کر بھیجیں۔ کتنی بار بولے کا جی چاہا مگر نا بول سکے۔ آج تم بولی ہو تو کہہ رہے ہیں۔ اجی تم کو تو خط بھی لکھوایا تھا۔ تو توں (تم تو) خط کا جواب بھی نا دیو۔ میری سحر کا بری ہے، ایسی لڑکی تم کو بتا دیں ہیں فہیمنی! کہیں بھی نا ملے گی۔ بیٹی ہے میری، اس لیے نا کہیں ہیں۔ سچّی، چراغ لے کے بھی ڈھونڈھو گی تو نا ملے گی۔ تورے بیٹا سے ہوتا تو میرے اطمینان رہتا۔ اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں بٹھا کے مارے گا۔"

"ہم جانیں ہیں بوبو۔ ارے میرا بس چلے تو ہم آج ہی سحر کو اپنے گھر لے جائیں مگر کا کریں شادی کرے والا مانے تب نا۔ ہاں ہم تو بوبو تورے خط کا جواب دیا تھا۔ اجی نیلا ایسا لفافہ بھیجا تھا۔ تو کونا ملا؟"

بتولن بی بہت زور سے چلّائیں، "ہائے رے اللہ او (وہ) لفافہ نیلا تھا فہیمنی! ہائے ای دیوانہ ڈاکیہ

لفافے کو لگے ایسے ہی میرے گھر میں پھینک کر چلا گیا ہوگا۔ ہائے ہائے فہیمن ایک روز بکری میری نیلا ایسا لفافا چبا چبا کے کھا رہی تھی تو او کے منہ سے جا کے چھینا کے ارے پگلی کاغذ کھا رہی ہے، تو ہاتھ میں پانچ روپئے کا ٹکٹ آ گیا۔ کتنے پیسے کا ٹکٹ لگا ئیو تھا فہیمن ؟"

"ہاں بو بو وہی پانچ روپئے کا۔"

پھر دونوں بہنیں خوب ٹھہا کا لگا کر بہت دیر تک ہنستی رہیں اور بے حال ہوتی رہیں۔

بتولن بی کے یہاں اوّل تو کوئی ڈاک وغیرہ آتی ہی نہیں تھی اور اگر کبھی کوئی ڈاک آئی بھی تو زیادہ تر ان کے دروازے پر بندھی بکری ہی سارے لفافوں کو کھا جاتی تھی اور ان ماں بیٹی کو کبھی پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کوئی ڈاک آئی بھی تھی کہ نہیں۔

بہن کے آنے کے بعد بتولن بی کو اپنے دُشمن زیادہ ہی یاد آنے لگے جنہوں نے ان کے شوہر کو تجارت میں دھوکا دیا تھا۔ پھر اس کے گناہوں کو مکمل طور پر گنوانے لگتیں۔ اور کیوں نہ گنواتیں، یہاں بڑے بڑے شعراء اور ادیبوں نے بھی اپنے لفظ و بیان سے اپنے فن پاروں میں اپنے دل کے بخار نکالے ہیں تو پھر بتولن بی نے کون سا گناہ کیا تھا۔

اللہ نے چاہا تو کبھی شاد نہ ہوگے
بستی کو میرے لوٹ کے آباد نہ ہوگے

(نامعلوم)

بتولن بی کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوؤں کی لڑیاں گرنے لگیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ پھر ہم سبھی ان کے اِرد گرد جمع ہو جاتے اور پھر بہت دیر کے بعد بتولن بی ٹھیک ہوتیں، اپنی کہانیاں سنانے لگتیں تو پہروں لوگ ان سے چپک کر بیٹھ جاتے۔ کچھ کہانیاں سچّی ہوتیں، ان کے بچپن کی اور بہار

آفریں دَور کی اور کچھ سنی سنائی۔ اگر کہیں پر خاموش ہو جاتیں تو وہ ان کہی بھی ایک کہانی بن جاتی۔ پھر کسی کے اندر وہ صلاحیت ہے تو ان بے نام قصوں کو خود ہی کہانی کا کوئی عنوان دے ڈالے۔

ہے درد اتنا کہ جب ہم چھیڑتے ہیں سرگزشت اپنی
تو سننے والے کہتے ہیں یہ افسانے کی باتیں ہیں

(کلیم عاجز)

کبھی کبھی وضاحت کرنے پر آمادہ ہوتیں تو جی جان سے گزر جاتیں اور کہیں کہیں پر صرف ہلکے سے دائیں بائیں آنکھوں کی پتلیوں کو گھما گھما کر ابہام سے ہی کام چلا لیتیں۔ کہانی کیا، زیادہ تر اپنی ہی زندگی کی کہانی یا محلّے والوں اور رشتہ داروں کی کہانیاں بیان کرتیں۔ کوئی گلزارِ نسیم یا سحر البیان والی کہانی نہیں۔ بس بلاارادہ موقعے بے موقعے اپنی باتیں، اپنے دل کی باتیں بیان کرنے لگتیں۔ کبھی بے جوڑ الفاظ کچھ اس طرح سے اَدا کر جاتیں کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی۔

اپنی زندگی کی تمام رنگینیوں، رفاقتوں، دلگداز محبتوں اور دل کو موم کر دینے والے واقعات کو غلط تلفظ اور رنگ برنگے محاوروں کے امتزاج سے جو اَدا کرتیں تو ان لمحوں میں ان کی سادگی اور پُرکاری اپنے عروج کو پہنچ جاتی۔ باتیں کیا کرتیں، اپنے جسم کو پوری طرح سے حرکت میں لے آتیں۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک سب کے سب جیسے ان جملوں کی ادائیگی میں ساتھ دینے لگتے۔

دل میں اگر کسی بات کو سوچ لیتیں تو پھر چند لمحوں میں ہی کسی کے ذرا سا بھی پرسشِ حال پر پان کی گلوریوں کو چباتے ہوئے یا کنارے ہو کر پان کی پرکی کو پھینکتے ہی ٹھنڈی آہوں کے ساتھ دل کا حال کھول کر رکھ دیتیں۔ یعنی وہ آہ ان کی سانسوں سے گزر کر خون کی گردشوں میں سما جاتی، پھر منٹوں میں آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ جاتی۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں اس شاہکار شخصیت کی باتوں میں نہ کبھی کوئی مزہ ملا اور نا ہی قریب سے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دردمندی کا کئی جذبہ جاگا۔ وہ تو ان کے قریب سے ایسے گزر جاتے جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ انہیں کبھی یہ اندازہ ہوا ہی نہیں کہ ان کی باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جسے سن کر انسان جھومنے لگے۔

ان کی دُنیا کس قدر محدود تھی۔ وہی ان کا چھوٹا سا گھر آنگن اور وہاں سے ہم لوگوں کے گھر کا راستہ اور پھر خان مرزا کا بازار جہاں چار پانچ دکانوں کا ایک سلسلہ تھا اور بس۔ یہی دو تین جگہ تھی جہاں وہ صبح اور شام اپنے ہرے سودا سلف کے تھیلے کے ساتھ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو سنبھالے ہوئے اور اسے سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی رہتی تھیں۔ بس زندگی کی چند ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انہیں جتنے پیسوں کی ضرورت تھی، وہ انہیں مہیا ہو جاتا تو وہ پھر مطمئن ہو جاتیں۔ ایسا لگتا کہ انہیں پوری آسائش اور لذّت مل گئی ہو اور پھر پوری قناعت کے ساتھ زندگی کے دن گزارتی رہتیں۔

لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب کہ انہوں نے اپنے سرکار کو یاد نہ کیا ہو۔ کبھی ہنس کر کبھی افسردگی کے ساتھ۔ ان کی یادیں بتولن بی کے دل و دماغ اور جسم و جان پر کچھ اس طرح اُترتیں کہ ان کے روئیں روئیں میں لرزش سی ہونے لگتی اور پھر وہ جیسے ہانپنے لگتیں۔ اگر وہ ہم لوگوں کے یہاں ہوتیں تو امّی ان کے قریب چلی جاتیں اور ان کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرتیں۔ پھر بتدریج ان کے چہرے پر اس دلاسے کی ٹھنڈک کا کچھ ایسا اثر ہوتا کہ پھر سے ان کی دلچسپ گفتگو کا جادو آنگن کی فضاؤں میں بول اُٹھتا۔ آس پاس کھڑے لوگ پھر سے ہنسنے مسکرانے لگتے۔

بتولن بی اپنے سودا سلف کے سبز تھیلے کو ہاتھ میں تھامے اندھیرے اُجالے، دھوپ اور چھاؤں سے گزرتی ہوئی زندگی کا سفر طے کر رہی تھیں۔ روز صبح سفید ساری میں لپٹی لپٹائی، جس پر پان کی سرخیوں کے

بے تحاشہ داغ اور عطر کے رنگوں کے نشان ہوتے، اسے سنبھالے ہوئے خوشبوؤں میں ڈوبی ہم لوگوں کے گھر میں داخل ہوتیں۔ اکثر جب میں اپنے کمرے میں پڑھتی لکھتی رہتی تو ان کے بولنے کی آواز کچھ اس طرح آتی جیسے کہ بتولن بی کسی مذاکرے یا مباحثے میں غرق ہو کر تقریر کر رہی ہوں۔ ان کی تقریر کی سامع سب سے پہلے تو میری امّی اور پھر دوسری تمام خادمائیں تھیں جو ان کی تائید کرتی ہوئی کہتیں کہ:

''ہاں جی بتولن بی، ٹھیک کہو ہو، تو اور کا ٹھیکے (ٹھیک ہی) تو کہو ہو۔''

ایک یا دو کُتے ضرور رہے۔ ایک کا نام ٹائیگر اور دوسرے کا نام جونی تھا۔ رات میں کمپاؤنڈ کا گیٹ بند کر کے کُتوں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا اور گھر کا ہر شخص کسی بھی فکر و تردّد کے بغیر رات بھر آرام سے بحفاظت سوتا، لیکن دن کے وقت گھر کی اُوپری منزل، جس پر ان دنوں کوئی کمرہ نہیں بنا تھا، کُتوں کو رکھا جاتا تھا۔ نیچے کی طرف آنے والی سیڑھیوں کے دروازے کو بند کر دیا جاتا تھا۔ بے چارے ٹائیگر کو بتولن بی سے کچھ اس طرح کا بغض تھا کہ انہیں دیکھتے ہی وہ چراغ پا ہو کر بے تحاشہ بھونکنے لگتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس کے بھونکنے سے ہم لوگوں کو یہ خبر مل جاتی تھی کہ بتولن بی اب آنگن میں آچکی ہیں۔

انہوں نے شروع ہی میں امّی سے کہا تھا، ''صاحب! آپ سب لوگ کتنے اچھے ہیں مگر ای ٹائیگر وا میری نظر میں کھٹکتا ہے۔ یہ کُتا روز ہی میرا دل دھڑکا دے ہے۔ ارے اس کو کہیں بھگا دیجیے نا حضور۔ ای کتا جس گھر میں رہے ہے، او (اس) گھر سے فرشتے ستّر گز دُور رہے ہیں۔ تو بھلا بتایئے صاحب، ہم ایسا کتا کاہے کو پالیں جب کی گھر دوار میں فرشتہ ہی نا آوے گا۔ اور صاحب آپ کا سوچتی ہیں، ای نالائق رات کو کوئی رکھوالی کرے ہے؟ ای منہ جھونسا رات بھر سوتا ہو گا۔ دن بھر بھوکے ہے۔ رات بھر سوئے ہے۔''

یہ سب سن کر امّی یہی جواب دیتیں، ''بتولن بی، کاش آپ سمجھ سکتیں کہ اس گھر کا کوئی بھی آدمی یہ نہیں چاہتا ہے کہ ٹائیگر اس گھر سے کہیں جائے، سوائے آپ کے اور میرے۔''

یہ سنتے ہی بے چاری سر جھکا کر خاموش ہو جاتیں۔

شروع شروع میں بتولن بی ٹائیگر سے کافی پریشان رہیں۔ اس کی بُرائی سے امّی سے اور پھر ہر آنے جانے والے سے کرتیں، لیکن روزانہ آتے جاتے ان کو ٹائیگر کی کچھ عادت سی ہوگئی، بلکہ کچھ دنوں کے بعد تو وہ ٹائیگر کو دیکھ کر مسکرانے لگتیں اور کہتیں۔

''ارے ہم کو دیکھ کر بگڑو ہوتا ٹیگر۔ ٹنگے رہو اوپرے (اوپر ہی)۔ تمرے نصیب میں اوہی سناٹا کوٹھا ہے۔ سڑو گے ہوئیں (وہیں)۔ بھوکو بھوکو اور بھوکو۔''

اور ان کی آواز سن کر ٹائیگر بھونکتے بھونکتے بالکل بے دَم ہو جاتا۔

لیکن ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ جس کا ہم لوگ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بتولن بی اپنے پورے آب وتاب سے وہی اپنی ساڑی اور چادر سنبھالے ہوئے گھر میں داخل ہوئیں اور حسب عادت ٹائیگر صاحب نے پھر بھونکنا شروع کیا۔ وہ بہ اطمینان صحن کو آہستہ آہستہ پار کر کے دالان کی طرف آنے لگیں جہاں امّی بیٹھی تھیں۔ نظر اوپر کی طرف اُٹھا کر ٹائیگر کو دیکھا اور مسکرائیں۔

''کا (کیا) کریہو (کروگے)۔ تمرا کسمت (قسمت) ہی خراب ہے۔ ٹنگے رہو۔ بھوکو ٹائیگر، بھوکو نا بھائی۔''

اور واقعی اس دن ٹائیگر بھونکتے بھونکتے ایسا بے حال ہوا کہ چھلانگ لگا کر اوپر سے نیچے صحن میں بتولن بی کے اوپر کود پڑا۔

اس وقت کا سماں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کیا عالم تھا۔ بے چاری بتولن بی زمین پر چاروں شانہ چت۔ چادر کہیں، پان کا بٹوا کہیں، کھڑاون کہیں۔ اس کے بعد پھر زمین سے اُٹھ کر ٹائیگر ان کو گھوم گھوم کر سونگھنے لگا۔ گھر کا ہر فرد آنگن کی طرف دوڑا اور بتولن بی کو زمین سے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی

صورت سے ان کو اُٹھا کر دالان کی چوکی پر لایا گیا۔ کافی دیر تک وہ بے ہوش رہیں۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مارا گیا۔ امّی نے ان کے گال پر تھپکی دی تب انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پھر بہت ہی کمزور آواز میں بولنے لگیں۔

"ہائے صاحب، ای نا جانتے تھے کہ کمبخت اوپر سے لے دے کے میرے ہی اوپر گر جا گا۔ نا صاحب اب ہم آپ کے یہاں نا آویں گے۔ چاہے تو او (وہ) رہے ہیاں (یہاں) یا ہم آویں۔"

پہلے تو سبھوں کو ان کی باتوں پر ہنسی آتی تھی لیکن آج سبھی لوگ ہاتھ باندھے بتولن بی کے چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔ یہ سب کچھ اس قدر جلد ہو گیا کہ بنی دادا (خاندانی ملازم) جو دالان میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے، وہ اپنی جگہ سے اُٹھ بھی نہ سکے۔ صرف انہوں نے اتنا کہا کہ:

"شکر ہے کہ نہ بتولن بی اور نا ٹائیگر کی ہڈی ٹوٹی۔"

بس رات اور دن کا یہی سب تماشا رہتا۔ ایک دن بتولن بی ہم لوگوں کے لیے مٹھائی خرید کر لائیں۔ انہوں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی کنارے والے کمرے کی کھڑکی سے بغیر کسی کو بتائے مٹھائی کی ہانڈی کو چھوٹے سے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ کھانے کے بعد وہ مٹھائی ہم لوگوں کو کھلائیں گی۔ ہمیشہ رات میں قریب نو بجے نوکر کُتے کو زنجیر سے کھولتا تھا، لیکن اس دن اس نے ذرا جلدی ہی کھول دیا۔ یہ سنتے ہی بتولن بی دونوں پاؤں تخت پر چڑھا کر بیٹھ گئیں۔

"ارے بنی، میرے جائے دیتا تب نا اس کی گردن سے پٹّی کھولتا۔"

لیکن اس رات ٹائیگر صاحب بڑے ہی خاموش تھے۔ میں ذرا باورچی خانے میں کسی کام سے گئی تھی۔ جیسے ہی وہاں سے واپس آئی تو میرے کان میں ایک آواز ایسی آئی جیسے کوئی خوب چٹخارے لے لے کر کوئی مزے دار چیز کھا رہا ہو۔ آگے بڑھی تو دیکھا کہ مٹھائی کی ہانڈی آنگن میں گھاس پر رکھی ہے اور

ٹائیگر میاں چٹخارے لے کر اور چبا چبا کر گلاب جامن تناول فرما رہے ہیں۔ اب اسے بھگا کر بھی کیا ہوتا۔ آدھی سے زیادہ مٹھائیاں تو ٹائیگر صاحب کھا ہی چکے تھے۔ پھر تو مت پوچھیے:

''ارے صاحب، ای (یہ) جناور نہیں ہے، بھوت ہے بھوت۔ بھلا بتائیے صاحب کہاں جا کے ہانڈی رکھی تھی اور کہاں سے ای جھاڑو مارا جان گیا کہ وہاں مٹھائی رکھی ہے۔ جا کمبخت، او تیرے نصیب کا تھا سو تو کو مل گیا۔ جا۔''

بتولن بی اور ٹائیگر کی مخاصمت یوں ہی برقرار رہی بلکہ بتولن بی کی لائی ہوئی مٹھائیاں کھا لینے کے بعد بھی ٹائیگر کے رویّے میں کوئی مٹھاس نہیں آئی اور بتولن بی کا بیر مٹھائی کے واقعے کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔

پٹنہ میں چوہٹے کے پاس کشیدہ کاری سکھانے کا ایک سینٹر کھلا تھا۔ مجھے بھی اپنے کالج کے امتحان کے بعد سلائی مشین سے کشیدہ کاری سیکھنے کی خواہش ہوئی اور پھر میں نے وہاں جانے کا پورا ارادہ بھی کر لیا۔ تنہا جانے کی اجازت تو تھی نہیں، امّی نے فوراً کہا کہ بتولن بی بھی تمہارے ساتھ جائیں گی۔ تم جب تک کشیدہ کاری سیکھتی رہو گی، یہ وہیں بیٹھی رہیں گی۔ بتولن بی فوراً اپنے جسم پر اپنی دبیز چادر ڈالتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

''چلو نا بھائی، کہاں جانا ہے۔''

میرا دل تو نہیں تھا کہ یہ میرے ساتھ جائیں لیکن خیر امّی کا حکم تھا تو میں اسے ٹال بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے صرف یہ خوف تھا کہ خدا جانے وہاں جا کر یہ کیسے کیسے بولیں گی۔ خیر ہم دونوں وہاں گئے۔

سینٹر میں جیسے ہی داخل ہوئے، ایک بڑی سی کرسی پر ایک دُبلی پتلی خاتون، کھڑے ناک نقشے کی، مانگ میں سیندور اور ماتھے پر بہت بڑا سا لال ٹیکا لگائے ہوئے بڑی ہی چوکنّی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے داخل ہوتے ہی ان کو ہیلو کہا۔ انہوں نے جواب دے کر پہلے تو مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھ کر معائنہ کیا۔ پھر

ایک منٹ کے بعد ہی بتولن بی اپنی کھڑاون کی آواز کے ساتھ چادر کو سنبھالتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ خاتون جو کہ بہت ہی مستعدی سے کرسی پر براجمان تھیں، وہ بتولن بی کو دیکھ کر اور بھی چونکی ہو گئیں۔ فوراً ہی پوچھنے لگیں۔

''کیا یہ بھی پھول بنانا سیکھیں گی؟''

میں نے بتولن بی کی بجائے خود ہی جواب دیا۔ ''نہیں نہیں۔ یہ نہیں سیکھیں گی۔ یہ صرف میرے ساتھ آئی ہیں۔''

تب جاکر اس خاتون کے چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ جاگی۔ بتولن بی کہاں رُکنے والی تھیں، فوراً بولیں۔

''کاہے ٹیچر جی، کا ہم نا سیکھ سکے ہیں۔ کاہے بوڑھے کا دل نا ہوئے ہے۔''

ٹیچر جن کا پرمیلا سنہا نام تھا، فوراً کہنے لگیں، ''نہیں، میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔''

پرمیلا سنہا کی ایک بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔ میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی اور ادھر بتولن بی ماشاءاللہ بولنے میں کچھ کم تو تھی نہیں۔ دونوں کا دو مختلف لہجہ اور اس پر آپس میں سوال جواب کرتی ہوئی مجھے دلچسپ تو لگ رہی تھیں لیکن مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں دونوں کی کسی بات پر بحث نہ شروع ہو جائے۔ ایک خالص ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرتیں تو دوسری کٹاری ٹولہ کی مقامی بولی۔ بتولن بی کا لہجہ بالکل مختلف تھا۔

پرمیلا سنہا نے پہلے میرا نام پوچھا، پھر میرا ایڈمیشن کرلیا۔ اس کے بعد انہوں نے بتولن بی کی طرف مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کا شبھ نام؟''

پہلے تو بتولن بی ان کا منھ دیکھنے لگیں، پھر اپنا نام تو نہیں بتایا لیکن کہنے لگیں۔

''دیکھیے، آپ جو بھی ہیں۔ میرا نام کبھی بھی کوئی نا پوچھے ہے۔ اور آپ میرا نام جان کے کا کیجیے گا۔ ارے ہم کو کا ای مشین چلانا ہے۔ اور دوسری بات ای کی آپ نام اتنا مشکل طرح سے کاہے پوچھیے ہے؟''

پرمیلا سنہا جو اس قدر باتونی خاتون تھیں، ان کو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ان کی بات کا اب کیا جواب دیں۔ اس لیے انہوں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ خاموش رہیں اور واقعی وہ بالکل خاموش رہیں۔ اسی بیچ ایک دوسری خاتون اپنی بہت ہی پیاری سی بہو کے ساتھ سینٹر میں داخل ہوئیں۔

اسی دوران پرمیلا سنہا نے مجھے سلائی مشین پر ایک اسٹچ سکھائی اور پھر اس کی پریکٹس کرنے کو کہا۔ میں اپنے کام میں لگ گئی اور بتولن بی ایک کرسی پر بیٹھی سب کی باتوں کو سنتی رہیں اور اپنے آپ میں جذب کرتی رہیں۔ مجھے وہیں پر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ساری باتیں بتولن بی اپنے اندر جمع کر رہی ہیں اور گھر جا کر یہ سب امّی کے سامنے دہرانے والی ہیں۔

اب پرملا سنہا پھر سے بولنا شروع ہوئیں۔ جو خاتون اپنی پیاری سی بہو کے ساتھ اندر آئی تھیں، ان کا پہلے ایڈمیشن لیا اور پھر ان پر سوالات کی بوچھار شروع ہوئی۔ ان کی بہو کو دیکھ کر بولیں۔

''کون ہیں ای آپ کا؟''

''ہمری پتوہ (بہو) ہیں''۔ اس عورت نے جواب دیا۔

''ت (تو) کا کرے ہے آپ کا بیٹوا (بیٹا)؟''

''اوتنی (ذرا) بتاہا (بے وقوف) ہے''۔ عورت نے جواب دیا۔

''ہائے رام! کاہے لگی (کس لیے) ایسی سندر لڑکی کے کسمت (قسمت) پھوڑ دئیں''۔ پرمیلا سنہا کہنے لگیں۔

وہ عورت بے چاری بالکل گھبرا گئی اور کنارے ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پھر پرمیلا سنہا جلدی سے اس کی بہو کو کہنے لگیں۔

"ارے بھائی آیئے نا...... آیئے نا۔ پھلوا (پھول) بنانا تو شروع کیجیے۔ گھبرایئے نہیں۔"

ادھر بتولن بی کرسی پر بیٹھی بیٹھی کچھ بولنے کے لیے کسمسانے لگیں۔ میں نے اشارے سے انہیں منع کیا کہ آپ خاموش رہیں تو بولیں، "چلو ہٹو!"

پرمیلا سنہا کے اس طرح سے بولنے پر سب لوگ بالکل خاموش ہو گئے، لیکن بتولن بی کا تو دل کیسے کیسے کر رہا ہوگا کہ وہ کسی طرح کچھ بولیں، لیکن شکر اللہ کا کہ اس وقت خاموش رہیں۔ پھر اس ٹیچر کو خود ہی خراب لگنے لگا تو بولنے لگی کہ:

"ارے بھائی ای بہت بڑا آدمی ہے۔ پٹنہ میں ان کو کونوں (کون نہیں) جانتا ہے۔ اور تو آپ ای بے چاری کا کاہے کو بیاہ کیں ہیں۔ بنس (ونش) بڑھانے کو؟ ہاں بنس بڑھانے کو۔"

پرمیلا سنہا کی کسی بھی بات کا اس عورت نے جواب نہیں دیا۔ مجھے واقعی اس پر بہت افسوس آرہا تھا اور پرمیلا سنہا پر غصہ۔ میں اس کشمکش میں تھی کہ اللہ اس ٹیچر کو کس طرح سے خاموش کیا جائے کہ یک بیک بتولن بی شروع ہو گئیں۔

"دیکھیے ٹیچر جی، آپ کو بہت پاپ پڑے گا اگر ای لڑکی نگوری کے سامنے کچھ اور بولیں تو۔ آپ آخر اتنا کاہے بولتی ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے نا بھائی۔"

اس وقت واقعی مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا جب بتولن بی بولیں تو۔ ویسے مجھے تو ڈر ہی لگ رہا تھا کہ آج بتولن بی نہ جانے اور کیا کیا بولیں گی، لیکن وہ بھی اس لڑکی کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئیں اور میں نے بھی خدا کا شکر اَدا کیا۔ اللہ اللہ کر کے کلاس ختم ہوئی۔ ہم لوگ جب سینٹر سے نکل

کر باہر جانے لگے تو پرمیلا سنہا پھر بولیں۔

''دیکھیے، ٹھیک سے جایئے گا۔ سامنے میڈیکل کالج کا چھوکرا سب چہار دیواری سے باندر نیر (بندر کی طرح) تاکتا رہتا ہے۔''

ہم تو وہیں پر ہنسنے لگے۔ گھر آ کر بتولن بی نے سارا قصّہ امّی کے سامنے ہو بہو ویسے ہی دہرایا۔ بالکل اسی طرح سے بول رہی تھیں جیسے پرمیلا سنہا بولی تھیں اور پھر بول بول کے ہنستے ہنستے دہری ہوئی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی گھر کے سارے لوگ بھی ہنس رہے تھے۔

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا کہ بتولن بی اور سحر اگر ہم لوگوں کے گھر نہ آتیں تو شاید کسی بھی طرح کا شور شرابہ ہمارے گھر میں ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی دلچسپی کا سامان رہ جاتا۔ ماں بیٹی جب آپس میں باتیں کرتیں تو اور بھی مزہ آ جاتا۔

''اے سحر، فون پر کبھی کسی سے بات کیو ہو؟''

''نا اماں، کبھی بھی نا۔ اور ہم بھلا کس سے بات کریں گے ہائے۔ میرے بہت شرم آتی ہے۔ دیکھو امّاں تین کام ہم کبھی نا کر سکے ہیں۔ فون پر بات کرنا، ٹارچ لے کر چلنا اور چھاتا لگا کے چلنا۔''

تو پھر بتولن بی سمجھاتیں، ''توں (تم) بس ایسی ہی رہ جاؤ گی جی۔ ارے بُنّی، لوگ سے بات چیت کرو، سب سیکھو، ان لوگ بہت کابل (قابل)، عالم پھاجل (عالم فاضل) ہیں۔ ہائے سمجھو کاہے نا ہو۔ آخر کہاں جا کے سیکھو گی۔''

شروع شروع میں سحر جب امّاں کے ساتھ ہم لوگوں کے گھر آئی تھی تو وہ اسی طرح کی باتیں کرتی تھی، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کے دل کے اندر چھپی ہوئی سبز وادیوں میں بہاروں نے اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔ بدلتے وقت کی تہذیب و تمدن، خوش نما پھولوں کی شکل میں انہیں وادیوں میں اپنا سر اُٹھانے

لگی۔اسے بھی اب 'ہلوٗ'بول کر فون پر بات کرنے کی خواہش ہونے لگی۔گلی میں رات کے اندھیرے میں ٹارچ بھی لے کر چلنے لگی اور برسات کے موسم میں اس نے چھاتا بھی لگالیا۔

ماں کہنے لگیں،''ان کے باوا (والد) ہی ان کو قران اور اُردو پڑھائین ہیں (پڑھایا ہے)۔دیکھونا بُنّی، بھلا بتاؤ سرکار میرے اس لڑکی کا کیا نام رکھ کے چلے گئے۔ارے ہم تو اوہی (اسی) وقت بولے تھے کہ اجی سرکار ای (یہ) جادو،سحر،ٹونا......ارے ای کا نام ہوا،کوئی بھلا سا نام رکھیے نا۔میرے جی میں تھا کہ اس کا علیمن رکھا جاتا مگر او بے چارے خوب صورتی اور فیشن والا نام رکھ کے چلے گئے بُنّی۔''

پھر تھوڑا سا خاموش ہوگئیں۔پھر بولیں،''اسی وقت اجی چھٹی میں بچّی کو گود لے کے یہی بولے تھے......دیکھتی نہیں ہو میری بیٹی کی طرح اس کا نام بھی خوب صورت ہے۔سحر کا معنی جانتی ہو؟اس کا معنی ہوتا ہے طلسم،سمجھی۔ایسے نام تو صرف اچھی کتابوں میں ہوتے ہیں اور تم نے تو کتابیں پڑھی نہیں ہیں۔''

''ارے ہم کہاں کبھی بولے بُنّی کہ ہم پڑھے لکھے ہیں۔ہم پھارسی (فارسی) کا جانیں۔جو پھارسی جانیں،اوہی اچھا اچھا بولے۔ہم ناعالم،ناپھاجل (فاضل)،مگر ایک بات بتادے ہیں بُنّی،ہم جانے ہیں سب۔ای جان لو۔''

سحر جب اپنی اُنگلیوں کے ناخن پر نیل پالش لگاتی تو ماں اسے کن انکھیوں سے دیکھتیں اور بہت خوش ہوتیں اور سوچتیں:

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

(اقبال عظیم)

لے دے کر سحر ہی تو ان کی زندگی کی واحد کرن تھی جو آب حیات کی صورت قطرہ قطرہ ان کے وجود

میں سما کر انہیں جینے کے لیے آمادہ کر چکی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر وہ نہال و نہال ہو جاتی تھیں۔ اس کی ہر اَدا پر اپنی نظروں کو وارتے ہوئے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں آٹھوں پہر گلے لگاتی رہتیں مگر محبت کے کسی بول کی ادائیگی اس کے سامنے نہیں کرتیں۔ جب اس پر پیار آتا تو یوں کہتیں۔

''ہم تو کو (تم کو) کھوب (خوب) جانیں ہیں۔ بڑی پھتوری ہو۔ ای جو تم ٹھنڈی الماری (فریج) کا ٹھنڈا پانی گُٹر گُٹر حلک (حلق) سے اُتارو ہو ای کب تلک چلے گا۔ ارے ہم تو ہیں پھکیری (فقیری) میں۔ ارے ہم کہاں سے جُڑاویں گے (کہاں سے لائیں گے)۔ یہاں اپنا تو بابو نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانہ اور تورے یہی سب سوجھ رہا ہے۔ ای بُنّی لوگ تو کو (تم کو) بگاڑ کے رکھ دِہن (دیا) ہیں۔ دیکھو سحر، صاحب جو کہیں، او (وہ) سنہیو (سنو گی)۔''

امّی جب ٹوکتیں، ''ارے کیا بتولن بی، آپ اس بے چاری کو کیوں ڈانٹتی رہتی ہیں۔''

تو بڑے ہی پُر جوش طریقے سے کہتیں، ''نہیں صاحب، کون جانے ہے کہ ای (یہ) کسمت (قسمت) ان کو کہاں لے جاگی کا ای جانیں ہیں؟ نہیں نا؟ کام کاج کچھو نہیں (کچھ بھی نہیں) کھائے کو ڈلم ڈل مل رہا ہے۔ اور بس بُنّی سب کے ساتھ ٹھی ٹھی، ٹھی ٹھی کرے میں تیز، ای لچھن ان کا ہر جگہ نا چلیہے (نہیں چلے گا)۔''

جب سحر ان کو گھور کر دیکھنے لگتی تو کہتیں، ''اب ایسے لال پیل ہوے کا جرورت (ضرورت) نا ہے۔''

سحر ماں کی باتوں کا کوئی خاص جواب نہیں دیتی اور ماں کو مسکرا کر دیکھتی۔ اس انداز سے کہ ہاں حویلی (وہ ہم لوگوں کے گھر کو حویلی کہتی تھیں) میں ہم موج کریں گے، تو تم کو کیا۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ واقعی بہت خوش رہتی تھی۔ جوانی میں تو یوں بھی بے بات کی ہنسی آتی ہے اور سحر تو خود بھی ایک بہت ہی خوش مزاج لڑکی تھی۔ کبھی ہنسنے پر تل جاتی تو اس کی ہنسی جسے روکنا بھی چاہتی تو نہیں رُکتی تھی۔ سحر کے قہقہے ہم

بہنوں کے ساتھ مل کر ہمارے گھر کے دالان، آنگن اور سلطان گنج کی فضا میں کسی خوش رنگ پھلجھڑی کی مانند کھل اُٹھتے۔ گھر کے سامنے لان میں اُترتی تو سبز موسم کی پُرکشش ٹھنڈک میں تتلی کی طرح پرواز کرنے لگتی۔ اس کے نرم گداز پاؤں شبنمی گھاس کے لمس کو محسوس کرتے تو اسے ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوتا۔ بیل بوٹوں کے نرم سائے اس کے سادہ لباس کو چھوتے تو وہ کھلکھلا اُٹھتی۔

جب بتولن بی سے ہم لوگ التجا کرتے کہ آج سحر کو رات میں ہم لوگوں کے یہاں سونے دیجیے تو اپنے گھر جاتے وقت ضرور کہتیں۔

''ٹھیک سے رہیو (رہوگی)۔ اُلٹی سیدھی بات زیادہ مت ہانکیو (بولوگی)۔ سوئے کے وقت اللہ کا نام لے کے سوہیو (سونا)۔ بجلی کے پنکھے میں توں بھی خوب خرخریو (خراٹا لے کے سونا)۔ کا تورے (تم کو) ہم جانے ناہیں کا، یہاں کا ہے رہنا چاہو ہو۔ کہاں ای شائیں شائیں حویلی کی ٹھنڈی ہوا اور کہاں او دہکتی کالی کوٹھری۔''

پھر چادر کھڑاون اور ساڑی سنبھالتی ہوئی اپنے مخصوص انداز میں روانہ ہو جاتیں اور سحر ان کے جانے کے بعد بے حد خوش ہوتی جیسے اسے پوری آزادی مل جاتی۔ رات میں ہم لڑکیاں دیر تک جاگا کرتیں۔ دُنیا جہان کے قصّے کہے اور سنے جاتے۔ سحر کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگتے اور ہونٹوں پہ ہنسی کے شگوفے کھلتے۔ اس کی آواز رات کے فسوں میں ڈوب کے اور بھی نغمہ سنج ہو جاتی۔ ہم لوگوں کی فرمائش پر وہ دھیمی آواز میں فلمی نغمے سناتی اور ہم سحر زدہ سے سحر کو دیکھا کرتے۔

سحر اپنی نوعمری کے کواڑ کو آہستہ آہستہ کھول کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ اس نئی دُنیا کے نظاروں میں اسے فلمی گانوں کی دھن سے اور ناولوں سے ایک عجیب سی لذّت ملنے لگی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ صرف دو تین بار ہی فلم دیکھنے گئی تھی، لیکن قریب قریب، روزانہ ان فلموں کا ایسا تذکرہ کرتی جیسے

بس آج ہی کسی وقت وہ فلم دیکھ کر آئی ہو۔ فلمی نغموں کی بھی وہ بے حد شوقین تھی۔ کسی کسی گانے کو سن کر وہ ساتھ ساتھ گاتی بھی جاتی۔ جب طلعت محمود کا کوئی اُداس گانا سنتی تو اس کی آنکھوں سے بلاوجہ آنسو ٹپکنے لگتے۔ جب میں پوچھتی کہ یہ کس خوشی میں بہایا جا رہا ہے؟ تو کہتی ''جب طلعت محمود گاتا ہے تو مجھے اندر سے رونے کا دل چاہتا ہے، کیوں؟ یہ مجھے خود بھی پتہ نہیں۔''

وہ نوعمری کی حد سے جوانی کی دہلیز کو اسی طرح پار کر رہی تھی جس طرح ریشم سرک کر ایک ہلکی سی جنبش سے ہی بس اِدھر سے اُدھر ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے، اس تبدیلی کا اسے جیسے خود بھی پتہ نہیں چلا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو جانا اس کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں موقع ملا، وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور لوگوں سے نظریں بچا کر خود کو گھورتی۔ اپنے بالوں کو سنوارتی، اپنی آنکھوں کے کاجل سے اپنی چمپئی رنگت کو اور بھی تیکھا بنا دیتی، پھر خود ہی مسکرا کر شرمانے لگتی اور کبھی کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ پھر وہ اپنی ہی ہنسی سن کر یہ سوچتی کہ اس کے اندر ایسی تبدیلی کہاں سے یک بیک آ گئی۔ اس تبدیلی نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا تھا۔ اپنے نقشِ قدم سے لپٹی ہوئی اس عجیب سی، انجان سی تبدیلی سے اسے روز بہ روز خود بھی تو پیار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دل کو جیسے پَر لگ گئے ہوں اور وہ جیسے بادلوں کے سنگ اُڑنے لگ گئی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اسے حُسن سے تو نوازا ہی تھا، عمر کے لمس نے اس کی ملاحت اور سحر انگیزی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ آنکھوں کی خوابناکی بڑھ گئی تھی اور اَن چھوئے خوابوں کے بوجھ سے پلکیں بھاری ہو چلی تھیں۔ لبوں کے غنچے اَن کہے بول اُٹھنے کے لیے نیم وا رہتے۔ اس کے اندر جانے کیسی حدّت تھی کہ بار بار وہ کھڑکی کھول کر خنک ہوا میں سانس لینے کے لیے بے قرار رہتی۔

وہ کھڑکی کھول کر جب بھی کھڑی ہوتی تو باہر کی ٹھنڈی جاں فزا ہوا اور اس کی خنکی ان دنوں

اس کی زندگی کا ایسا سرمایہ تھی جو اس کی طبیعت کو بشاش کر دیتی تھی۔ کھڑکی کا کھولنا اور اس کی طبیعت میں نکھار آنے کا رشتہ چولی دامن والا تھا۔ اِدھر اُدھر کا کام جلدی جلدی سے ختم کر کے سیدھے اپنی پسندیدہ کھڑکی کی طرف بڑھتی تھی اور کافی کافی دیر تک یونہی کھڑی رہتی۔ اسے اندر سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید کوئی حسین حادثہ بہت ہی جلد کسی بھی سمت سے آ کر کسی خوشبو کی طرح اس سے ٹکرانے والا ہے، لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ کب اور کس شکل میں۔ اسے خود کسی چیز کی جستجو نہیں تھی۔ کھڑکی کے باہر پیڑ پودے، ہریالی، خوش نما رنگ برنگے پھولوں کی قطاریں، کچھ سبز مخملی گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین تھی جس پر وہ ننگے پاؤں چلتی تھی تو بے ساختہ کھلکھلانے لگتی تھی۔ مجھے کہتی ''تم بھی چلو نا، دیکھو کتنا اچھا لگتا ہے''۔ گنگا کی طرف سے آتی ہوئی سرد خوش گوار ہوائیں جو پژمردہ دلوں کو بھی شاداب کر دیتی۔ سحر تو بہار کے دلکش موسم کی مہک کو اپنے آپ میں چن چن کر جذب کرتی جا رہی تھی۔ ایک خوش نما تتلی رنگ برنگے پھولوں کو چھوتی ہوئی گزرتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے اندر رنگوں کا ایک انبار لگا چکی تھی، جو اس کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشوں کے نقش، خاکے اور دائروں کو جگمگاتے چلے جا رہے تھے۔ اپنے تصور کے رستے کے دونوں طرف کی ہریالی کے بیچ سے وہ گنگناتی ہوئی رنگوں کی بارش میں گزرتی گئی۔

سحر کو امّی نے کبھی بھی کوئی کام کرنے کو نہیں کہا۔ وہ خود ہی ہر کام میں لوگوں کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتی۔ گھر کے ہر کام کے لیے ایک ایک آدمی موجود تھا لیکن سحر اگر باورچی خانے میں چلی گئی تو بوا سے کہتی، ''آٹا گوندھ دوں بوا؟''

پھر کیا تھا، ڈونگے میں آٹا لے کر گوندھنے بیٹھ جاتی اور مسکرا مسکرا کر، گنگنا گنگنا کر پورے جوش و خروش سے نرم نرم آٹا منٹوں میں گوندھ کر رکھ دیتی۔ وہ شاید یہ سوچتی تھی کہ آخر میں اس گھر میں کس حق سے رہوں؟ مجھے کچھ تو کرنا چاہیے۔ یہ وہ سوچتی تھی لیکن ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا تھا۔ میں تو اس سے

سگی بہن کی طرح پیش آتی تھی۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہوں اس لیے مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے میری کوئی چھوٹی بہن آ گئی۔

ماں کی دی ہوئی دبیز چادر ان کے حکم کے مطابق اپنے سر پر رکھ کر اور جسم کو پوری طرح سے ڈھک کر ہی گلی میں اُترتی تھی۔ اسے تو یہ معلوم ہی تھا کہ اس کی ماں ہمیشہ ہی کسی انجانے خوف سے رات دن ہراساں رہتی ہے۔ اسے قدم قدم پر ٹوکتی ہے۔

''دھیرے بولو...... اجی ای (یہ) پاؤں پٹخ پٹخ کے کاہے (کیوں) چلو ہو، تمرے ایسے چلے سے بابو میرا دل دہلے ہے...... دیکھو بابو، ایک بات سن لو، اکیلی لڑکی سڑک پر کھلی تجوری کی طرح ہوئے ہے۔''

اس وقت سحر صرف مسکرا دیتی لیکن واقعی گلی میں اُترتے وقت وہ بہت زیادہ محتاط رہتی تھی۔ کسی بھی گھورتی نظر سے وہ بہت خوف کھاتی تھی۔ اپنی نظریں جھکائے ہوئے وہ جلدی جلدی گلی پار کر کے اپنے چھوٹے سے مکان میں داخل ہو جاتی۔ کبھی کبھی ماں کی بہت ساری ہدایتیں اسے ناگوار بھی لگتیں مگر پھر دوسرے ہی پل وہ ان کھردرے الفاظ کو موتی بنا کر اپنے گلے کا ہار بنا لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی ماں کے اندر کی تیرگی کی ایک واحد کرن ہے جسے مسکرا کر چمکتے رہنا ہے اور پھر وہ انہیں ہدایتوں کو ذہن میں رکھ کر ہم لوگوں کے گھر سے نکلتی اور نہایت برق رفتاری سے قدم بڑھاتے ہوئے آگے نکل جاتی۔ وہ اس محلّے کے راستوں سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔

جس دن چودھویں کا چاند اپنی چاندنی کو ہر طرف بکھیر دیتا تھا، ہم سبھی مل کر گنگا ندی کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے مندر کی سیڑھیوں پر گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ گنگا کی لہریں اس مندر کی نچلی سیڑھیوں سے ٹکراتی رہتی تھیں جس کا تماشا جتنی دیر تک بھی دیکھتے رہتے، دل نہیں بھرتا تھا۔ سحر بھی ہمیشہ ہی ہم لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد پتلی پتلی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے نکل کر گنگا کے بالکل قریب

جانے میں اسے بھی بہت مزہ آتا تھا۔ زیادہ تر رات میں اپنے گھر ہی جا کر سوتی تھی۔ اکثر گھر جاتے وقت جلدی جلدی چلنے میں کبھی کبھی کسی پتھر یا پھر اُونچی نیچی زمین سے ٹکرا کر ہلکے سے لڑکھڑا جاتی مگر پھر دوسرے ہی پل سنبھل کر آگے بڑھ جاتی اور دوڑتی ہوئی اپنے گھر کے دبیز پردے کو پرے کر کے گھر میں داخل ہو جاتی۔ اس کے نازک سے سہمے ہوئے دل میں اپنے غریب ہونے کی کسک ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی رہتی تھی کہ:

''غربت بھی ایک مرض کی طرح ہے۔ اور جانتی ہو یہ مرض لا علاج ہوتا ہے۔''

یہ سُن کر میں اس سے بحث کرنے لگتی تھی۔

''بالکل غلط۔ غربت ہی کا تو علاج ہے، باقی دوسرے امراض کا علاج البتہ ناممکن ہے۔''

پھر میرے اس جواب پر کہتی، ''تو بتاؤ میں کیا کروں، کون سی ڈگری لے کر کہاں جاؤں؟ کیسی نوکری کروں کہ میری ماں کو اس بھاگ دوڑ والی نوکری نا کرنی پڑے۔ میرے پاس تو کوئی ڈگری بھی نہیں ہے۔ جن کے پاس ڈگری ہے وہ سارے جہان میں (اس کا مطلب ہوتا ہندوستان میں) اپنی ڈگری ہاتھ میں لیے دوڑتے پھر رہے ہیں اور غربت، غربت تو اسی طرح اپنی جگہ پر اٹل فیصلہ لیے کھڑی رہتی ہے۔''

یہ سب کہتے کہتے وہ نڈھال سی ہو جاتی اور خاموش ہو کر بیٹھ جاتی۔ میں بھی لاجواب ہو کر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی سی خاموشی کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔

''اچھا چلو، میں کپڑے ہی اگر سی لوں گی تو پتہ ہے کہ مجھے کتنا پیسہ ملے گا؟ میں نے غفور بھائی سے پتہ لگوایا تو معلوم ہوا کہ آٹھ روپے میں ایک درجن بلاؤز سینا ہوگا۔''

میں یہ سن کر واقعی ہنسنے لگی۔ میں نے کہا، ''سحر! تم اس کام دھام کو چھوڑو۔ تم سکون سے ہم لوگوں کے ساتھ رہو اور خوش رہو۔''

کبھی کبھی اپنی غربت اور ماں کی کسمپرسی اس کے قلب وذہن پر کسی آسیب کی طرح سوار ہو جاتی۔ ایسے لمحوں میں ہماری کوئی تسلّی اور دلاسہ اسے قنوطیت کی دبیز چادر سے باہر نہ لا پاتا، لیکن یہ دورانیہ زیادہ طویل نہ ہوتا اور وہ پھر پہلے ہی کی طرح ہم لوگوں میں گھل مل کر کوئل کی طرح کوکنے لگتی، مورنی کی طرح تھرکنے لگتی۔ پھر وہ ہوتی اور اس کا من پسند دریچہ!

جب وہ کمرے کے دریچے کے سامنے کھڑی ہوتی تو ٹھنڈی ہوائیں اس کے کان میں کچھ اس طرح سے سرگوشیاں کرتی ہوئی اس کے آراستہ بالوں کو اُلجھاتی ہوئی آگے نکل جاتیں کہ بس۔ وہ تو ان کی شوخیوں کو محسوس کر کے مسکرا دیتی۔ اپنی بند آنکھوں میں اس نے کئی بار اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھا تھا اور ہر بار ہی اس نے پھولوں کی مالا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کا استقبال کیا تھا۔ ایسے خیال سے بھی اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگتا۔ اُس کا دل جو بالکل ایک کورے کاغذ کی طرح تھا ناشنیدہ اور ناگفتہ حروف جس کا مقدّر تھا۔ اس پر ستاروں سے پَرے زینہ زینہ اُترتے ہوئے محبت کی روشنی میں لپٹے ہوئے چند حروف اس کے وجود پر چکّر کھا رہے تھے۔ اسی دریچے کے سامنے کھڑے کھڑے شام چپکے سے رات میں ڈھل جاتی اور وہی رات اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ نغمہ سنج ہوتے ہوئے اس کے روبرو ایک سفید پردے پر بہار کے سارے رنگوں کو بکھیر کر تھر تھرا اُٹھتی۔ دریچے سے ہٹتی تو دیوار سے لگے آئینے میں اپنی آنکھوں کے نشے کو دیکھ کر وہ خود ہی شرما جاتی۔

سحر ایک بہت ہی حسّاس لڑکی تھی۔ اس کی عمر میں کسی بھی لڑکی کو اپنے اِرد گرد کے حالات کی خبر ہی کب رہتی ہے۔ مجبوریوں، محرومیوں اور غربت کی فکر و تردّد کرنے کے لیے تو ان کے ماں باپ ہوتے ہی ہیں۔ بچّے تو بس اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ صرف انہیں پیٹ بھر کر کھانا ملتا رہے تو پھر کہاں کسی چیز کی فکر ہوتی ہے۔ سحر چونکہ ہم لوگوں کے گھر آ گئی تو بہت حد تک اپنی اور اپنی ماں کی مجبوریوں کو ایسا لگتا تھا کہ

جیسے بھول گئی ہے۔اس لیے کہ امّی نے کبھی بھی ایک کام کرنے والی کی بیٹی کی طرح اس کے ساتھ سلوک نہیں کیا۔جیسے ہم لوگ رہتے تھے ویسے ہی وہ بھی رہتی تھی۔ کپڑا لتّا، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا سب کا سب ایک جیسا تھا۔اس لیے بہت خوش بھی رہتی تھی۔

خوشبو، گیت اور رنگوں کو چاہنے والی ہم لوگوں کے گھر میں اپنی غربت کو پَرے رکھ کر ہواؤں کی سرگوشیوں کو سننے میں محو ہوگئی۔اس کے دل کی بے بہا خواہشوں نے اس کے پورے وجود پر ایک قیامت برپا کردی اور وہ اپنی خواہشوں کے تلاطم میں کھوتی چلی گئی، ڈوبتی چلی گئی۔

سحر کی امّاں بھی اپنی کن انکھیوں سے سحر کو چپکے چپکے سے دیکھ کر اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔اسے اُردو بہت اچھی طرح سے پڑھنا لکھنا تو آتا ہی تھا، اب شعروشاعری سے بھی کچھ شغف ہو چلا تھا۔کچھ انگریزی کے الفاظ بھی جان گئی تھی جس کا استعمال وہ جا بجا اپنی باتوں میں کرتی۔ابا جب ہم لوگوں کو اُردو اور فارسی پڑھاتے تو وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ اپنی کاپی لے کر بیٹھ جاتی۔ذہین اس قدر تھی کہ ہر بات کو بہت جلد اپنے آپ میں جذب کرلیتی۔یہ سب دیکھ کر ماں کہتیں۔

"ارے پڑھو لکھو نا بھائی، ای (یہ) کا ہم منع کرر ہے ہیں۔مگر زیادہ اُڑو مت۔"

اکثر امّی سے تذکرہ کرتیں، "صاحب! کوئی اچھا سا لڑکا میری سحر کے لیے مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

اور امّی ہمیشہ انہیں دلاسہ دیتیں، "ہر کام وقت پر ہوتا ہے بتولن بی، آپ گھبرایئے نہیں۔انشاءاللہ جو ہوگا وہ اچھا ہی ہوگا۔"

وقت گزرتا گیا۔سحر کے لیے کوئی حسب خواہ لڑکا بتولن بی کی نظر میں نہیں تھا جس کے ہاتھ میں سحر کا ہاتھ دے کر وہ مطمئن ہو جاتیں۔انہیں سحر کی پسند و ناپسند کا بھی خیال رکھنا تھا لیکن انہیں اپنے دائرے کا بھی اندازہ تھا۔ہمیشہ کہتیں۔

''بُنّی لوگ کا نکل (نقل) مت کرو بابو، اپنی اوقات کو سمجھو کی تم کا (کیا) ہو۔''

ادھر سحرا اپنے ہاتھوں سے طاق اور دریچے میں ننھے ننھے دیئے جلاتی اور کھلکھلاتی جاتی۔ اسی دریچے سے وہ سامنے کے پڑوسی کے منجھلے لڑکے شہزاد کو گھر سے باہر آتا جاتا روز دیکھتی تھی۔ شہزاد کو اس نے نہ تو کبھی نزدیک سے دیکھا تھا اور نا ہی کبھی ملی تھی، لیکن جب بھی کبھی اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتی تو کہتی۔

''دیکھو دیکھو، ہیرو صاحب لگتا ہے۔ اب کالج جا رہے ہیں۔ دیکھو نا بال کا اسٹائل بالکل دیو آنند والا ہے۔''

اور ہم لوگ خوب ہنستے۔ ہم نے ایک دن اس کو ٹوکا بھی۔

''کیا سحر، کہو تو خاور شوق صاحب کے بیٹے سے تمہارا رشتہ بھیج دوں۔ پتہ ہے وہ کون ہے۔ وہ یہاں کے بیرسٹر کا منجھلا لڑکا ہے۔''

تو وہ جواب دیتی، ''کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ کہاں وہ اور کہاں ہم، یہ کبھی سوچا ہے۔''

میں بھی چپ ہوگئی۔ اس لیے کہ بات غلط نہیں تھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ بس ایک مذاق کی بات تھی لیکن میں یہ بھی سوچتی تھی کہ نہ جانے سحر کی شادی کہاں ہوگی۔ بتولن بی کو اس بات کی بے حد فکر تھی۔

''اب دیکھو کون کہاں سے آ کے کمل کے پھول کی طرح کھلیئے (کھلے گا)۔ کون کل اونٹ بیٹھے گا۔ بہت ڈر لگے ہے صاحب، ای بی بی کا لام قاف تو بہت چل رہا ہے، دیکھیے کا ہووے ہے۔''

کمرے کی اس کھڑکی کے قریب جاتے ہی سحر کے چاروں طرف ایک عجیب سی سنہری روپہلی روشنی پھیل جاتی تھی اور اس روشنی میں وہ کچھ اس طرح سے سرشار ہو جاتی کہ اس کا سارا ہی دن گنگناتے ہی گزر جاتا، حالانکہ یہ سب مذاق کی ہی باتیں تھیں لیکن جس طرح سے ان دنوں اس کے دل کی حالت ہو رہی تھی، اس میں شہزاد کا سراپا بالکل سج گیا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کا بہت تذکرہ کرتی تھی لیکن سماج

کے اصولوں کو سوچے بغیر جب دل ہی دل میں شہزاد کو چاہنے لگی تھی تو غلطی سے بھی اس کا نام نہیں لیتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ شہزاد کا نام اس کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ اگر کبھی اس کا تذکرہ باتوں باتوں میں آ گیا تو اس کا چمپئی رنگ گلابی ہو جاتا تھا اور پھر بہت ہی آہستہ سے ہم لوگوں کے پاس سے کہیں اور سرک جاتی تھی۔

اسے شہزاد کے گھر سے نکلنے کا انتظار رہتا۔ خود بخود وہ نو بجے خاموشی سے کھڑکی کے قریب چلی جاتی جہاں سے خوشبوؤں کی ایک بارات گزرتی تھی۔ سارے پھول اور تتلیاں بھی اسے مسکرا مسکرا کر دیکھتے اور کھلکھلاتے۔ ہواؤں کا نرم جھونکا اسے خوشبوؤں سے کچھ اس طرح سرشار کر دیتا کہ وہ بے خود ہو جاتی۔ اب وہ مجھ سے بھی نظریں بچا کر کھڑکی کے پاس جانے لگی تھی۔ محبت نے اس معصوم سی لڑکی کو چوری کی اُدائیں سکھا دی تھیں، لیکن میں بھی خاموشی سے اس کے چہرے پر جذبوں کی سوزش اور آتے جاتے رنگوں کی بارش کو دیکھتی رہتی تھی جو کہ صبح کے نو بجے اسے بیتابانہ دریچے تک کشاں کشاں لے جاتے تھے لیکن اس نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ سارے اَن کہے الفاظ اس کے اندر ہی اندر گردش کر رہے تھے۔

اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر اس کے دل کا راز فاش ہو گیا تو کہیں یہ پھول جیسی زمین اس کے لیے تپتی ریت نہ بن جائے۔ پھر وہ اور اس کی بوڑھی ماں کس طرح اس غربت میں اتنی بڑی رُسوائی کو برداشت کر پائیں گے، لیکن پھر بھی وہ اپنی آنکھوں کو بند کر کے اپنے جذبوں کے خوش گوار جھونکوں کے روبرو کھڑی ہو کر سوچنے لگتی۔

''اے خدا! یہ خوشبو میرے ساتھ ہمیشہ رہے۔ کبھی بھی مجھ سے جدا نہ ہو، کبھی نہ بچھڑے۔ میں کبھی بھی کسی کو یہ راز نہیں بتاؤں گی، کبھی بھی نہیں۔ اور کسی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے، کسی کو انسان خاموشی سے بھی تو چاہ سکتا ہے۔''

وہ اس الوہی جذبے کو خاموشی سے سینچتی رہی۔ خاموشی کی بھی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ وہ لہروں

اور ترنگوں کی صورت دوسرے وجود کو اپنا احساس کراتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

شہزاد کو جب سے وہ جانتی تھی اس دوران شہزاد دو تین بار ہی ہم لوگوں کے گھر ابا سے ملنے آیا تھا۔

سحر نے چائے ناشتے سے اس کی تواضع بھی کی تھی، لیکن شہزاد کے ساتھ وہی ہوا کہ:

کعبے کا احترام بھی میری نظر میں ہے
سر کس طرف جھکاؤں تجھے دیکھنے کے بعد
آواز دے رہی ہے میری زندگی مجھے
جاؤں یا میں نہ جاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

شہزاد نے اسے نزدیک سے صرف تین یا چار بار ہی دیکھا ہوگا اور کچھ باتیں کی ہوں گی لیکن اسے دیکھتے ہی وہ ایسا گرویدہ ہوگیا کہ خدا کی پناہ! میں نے بھی سحر کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو اپنے دل میں یہی سوچ رہی تھی کہ خدا جانے یہ بجلی کہاں گرے گی۔ یا اللہ! یہ کہیں کسی کو لے نہ ڈُوبے، اور وہی ہوگیا۔ یوں بھی کسی کو کسی سے عشق ہو جاتا ہے، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ایسی ہی بے ساختہ اور شدید محبت اُبھری جو نا قابلِ یقین ہے۔

میں نے کئی بار چھپے چھپے انداز سے سحر کو ٹوکا بھی۔

''سحر بیگم! سحر بیگم! آج کل آپ دریچے کے پاس نا ہی جائیں تو بہتر ہے۔''

وہ جواب دیتی، ''نہیں نہیں، میں کہاں جاتی ہوں۔ تم کو کیا لگ رہا ہے کہ میں کسی سے محبت کرنے لگی ہوں، بالکل غلط۔''

مجھ سے اس طرح کی باتیں بھی کرتی گئی اور ساتھ ساتھ شہزاد کے ساتھ اس کی محبت بھی پروان چڑھتی رہی۔ اپنی اور ماں کی غربت کو سوچتے ہوئے بھی اس کے دریچے کے آسمان پر شاخوں کی تحریروں

میں جوراز چھپا تھا، اس سے وہ دیوانگی کی حد تک پیار کرتی تھی۔ اس کے اس راز کا اگر کسی کو تھوڑا سا اندازہ تھا تو وہ صرف مجھے تھا۔ سحر کی ماں جو ہمیشہ کنکھیوں سے اس کی ہر اَداؤں پر کڑی نظر رکھتی تھیں، یہاں ان سے بھی چوک ہوگئی۔ انہیں بھی اس کی خبر نہ ہوسکی کہ سحر کس کی محبت میں پاگل ہو رہی ہے۔ اپنے ہی لہجے میں اس پر ہدایتوں کی بوچھار رات دن کرتی رہیں۔

''سحر، زیادہ فیسن (فیشن) کرے کی ضرورت نا ہے۔ بیاہ ہوگا تو چھمک چھلو بنو گی جی۔''

ماں کی اس بات پر کبھی کبھی سحر جھنجھلا بھی جاتی، ''اماں کا (کیا) فیشن کیا ہے؟ بولو، بولو نا۔''

''دیکھو بابو، تمرے ہی لیے بولیں ہیں۔ ایسی لال پیلی مت ہووَ۔ جو کہیں سو سنو۔ ہم تو کو (تم کو) نا ٹوکیں گے تو اور کون ٹوکے گا۔ نکڑ والا غلام نبی، جو سبزی بیچے ہے؟ ارے ہم ہی نا تورے اچھے بُرے کا جانیں ہیں۔ اجی ہم ہی نا بولیں گے۔ جرا (ذرا) ہوش میں رہو۔''

پھر سحر چپ ہو جاتی۔

سحر کی رنگ برنگی دُنیا میں کبھی کبھی کوئی سہا ہوا سا احساس داخل ہونے لگتا تو وہ بالکل ہی چپ ہو جاتی۔ اپنی مجبوریوں کے متعلق سوچتے ہی اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں لیکن پھر بھی اپنے آنسوؤں کو کسی طرح چھپا لیتی۔ اب وہ شہزاد سے کئی بار مل چکی تھی اور شہزاد نے بھی اس سے اپنی محبت کا اظہار بڑے ہی کھلے الفاظ میں کر دیا تھا۔

''میں تمہارے بغیر جی ہی نہیں سکتا سحر۔''

شروع سے ہی شہزادؔ سے میری سگی بہن سمجھتا تھا۔ ان لوگوں کے گھر سے ہم لوگوں کا آنا جانا نہیں تھا۔ بس اِدھر اُدھر امّی اور ابا سے اس کے گھر والوں کی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

پہلی بار جب وہ ہم لوگوں کے احاطے میں داخل ہوا تھا تو میں سحر کے ساتھ باہر باغ میں کرسی پر

بیٹھی تھی۔ شہزاد کو دیکھتے ہی ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ شہزاد کے ہاتھوں میں کوئی کتاب تھی جسے وہ ابّا کو واپس کرنے آیا تھا۔

''اسے چچا کو دے دیجیے گا۔''

پھر اس نے پُر اشتیاق نظروں سے سحر کو دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ سحر تو اس کو روز ہی کالج جاتے ہوئے دیکھتی تھی اور شہزاد بھی اپنی نظریں اُٹھا کر اسے چپکے سے دیکھ لیتا تھا۔ جس روز وہ گھر آیا تھا، اسی دن سحر اس کی دلکش شخصیت پر نثار ہو چکی تھی۔ شہزاد کے لہجے کی شائستگی اور بات چیت کے انداز نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اس کی ہر اَدا سحر کا دل موہ چکی تھی۔ شہزاد کا بھی اُدھر خود یہی حال تھا۔ اسے سحر کے حُسن اور مسکراہٹ نے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

لیکن نہ تو سحر کے لب کھلے اور نہ میں ہی کچھ بول سکی کہ سحر کون ہے، کس کی بیٹی ہے اور اگر میں کچھ کہنا بھی چاہتی تو کیا کہتی کہ سحر کی امّاں ہمارے گھر کا سودا سلف لاتی ہیں۔ کیا کبھی بھی شہزاد یہ سُن کر پھر ہم لوگوں کے گھر آتا یا سحر سے ویسی ہی محبت کرتا؟ ایسے ہی خیالات میرے ذہن میں چکّر لگاتے رہتے، لیکن میں نے سحر سے یہ ساری باتیں نہیں کہیں۔ یہ باتیں کہنے کی تھیں بھی نہیں۔

پھر میں سوچنے لگی کہ دُنیا میں قدیم زمانے سے یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ سماج کے ڈھانچے کی تراش خراش کر کے روزگار کو نہ جانے کتنے حصّوں میں بانٹ کر سبھوں پر الگ الگ نام کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔ اور پِھر لوگ خود ہی ایک دوسرے کو اُونچے اور نیچے خانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور اسی لحاظ سے کوئی کسی کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی کو حقارت سے۔ سحر کی صندل جیسی پیشانی پر جو لیبل تھا وہ اس کے لیے ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ اپنے ارمانوں کے گھنے جنگل میں جشن مناتے ہوئے خود کو سب کے برابر ثابت کرنے کے باوجود وہ اپنی پیشانی سے اس لیبل کو مٹا نہیں سکی۔ اُردو پڑھنا تو وہ پہلے ہی سے جانتی تھی،

انگریزی بھی پڑھ کر سمجھ لیتی تھی اور اپنے نازک سے دل کے جذبات کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُردو میں تھوڑی تھوڑی شاعری بھی کر لیتی تھی۔

شہزاد سحر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی چاہ میں اِدھر بار بار آنے لگا لیکن زیادہ تر وہ کسی نہ کسی بہانے سے کہیں چھپ جاتی۔ اسے یک بیک ایسا لگنے لگا کہ شہزاد کو اگر اس کی امّاں اور اس کے بارے میں پتہ چلے گا تو خدا جانے کیا ہوگا۔ میں اکثر سوچتی کہ اس طرح سے کب تک چلے گا۔ ایک نہ ایک دن تو حقیقت عیاں ہوگی ہی۔ سحر کو جلد از جلد بتا دینا چاہیے کہ وہ کون ہے تاکہ شہزاد کو سچائی کا پتہ چل جائے۔ اگر وہ گھر میں کام کرنے والی خاتون کی بیٹی بھی ہے تو کیا ہوا۔ جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہے۔ شہزاد اگر سحر کو پسند کرتا ہے تو اسے یہ سب بھی قبول کرنا پڑے گا، چاہے وہ کسی کی بھی لڑکی ہو۔ اگر اس کا خاندان بہت اعلیٰ ہے تو سحر کا بھی خاندان بہت اعلیٰ تھا۔ یہ لوگ جو عقل اور دانش مندی کا تاج پہن کر سفید شفاف لباس میں ملبوس ہیں، اپنے ہر انداز سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں سیاسی، سماجی اور مذہبی کوتاہیوں پر تنقید کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے، معاشرے کے رکھوالے ہیں تو پھر سامنے آ کر سحر اور شہزاد کے ساتھ قبول کریں۔ شہزاد کو سحر سے بے انتہا محبت ہے اور وہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُبھرتے رہے۔ میں اب بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ مجھے سب کچھ خود ہی کرنا ہے۔ یعنی سحر کی رازدار کی حیثیت سے۔ شہزاد کو یہ جلد ہی بتانا ہوگا کہ سحر میری سگی بہن تو نہیں ہے لیکن سگی بہن سے کم بھی نہیں ہے۔

میں نے سحر کو بھی سمجھایا کہ جلد از جلد شہزاد کو حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ میرے بہت سمجھانے پر سحر آخر تیار ہو گئی کہ وہ آج ہی شہزاد کو سب کچھ بتا دے گی۔ اس نے بھی آخر یہی سوچا کہ اب میری تقدیر میں جو ہونا ہے وہ ہو ہی جائے۔ اس لیے کہ وہ بھی ان ساری ذہنی اذیتوں سے تھک چکی تھی۔ آخر یہ آنکھ

مچولی کا قصہ کب تک چلتا رہے گا۔

میں نے شہزاد کو فون کیا اور اپنے گھر بلایا۔ سحر شہزاد کے سامنے آ گئی، لیکن بہت ہی سست قدموں کے ساتھ، جیسے کہ کوئی بہت افسردہ سی کہانی سنانے والی ہو۔ چہرے کی رنگت بالکل اُڑی ہوئی تھی۔ شہزاد کے سامنے آ کر اس نے پہلے اپنی بوجھل پلکوں کو، جو من بھر کی تھیں، اُٹھایا اور خود کو حالات کے سپرد کرتے ہوئے شہزاد کو دیکھنے لگی اور سوچنے لگی:

''اب مجھ میں کیا دھرا ہے۔ مجھے اگر اسی دریچے کی اوٹ میں رہنے دیتے تو میں بھی خوش رہتی اور تم بھی۔ میں کون ہوں، آج یہ تم جان لو۔ ایک بوڑھی خاتون، جو سڑکوں پر دھول اُڑاتی ہوئی حویلی کا سودا سلف لاتی ہے، اس کی بیٹی تمہارے روبرو ہے۔ آؤ اور میری تقدیر کا جو بھی فیصلہ کرنا ہے، کر ڈالو۔ آج مجھے کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ چاہے اِس پار یا اُس پار۔''

شہزاد سحر کے چہرے کے تاثر کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

''کیا ہوا سحر؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

اس نے جواب دیا، ''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

شہزاد نے سحر پر ایک بڑی ہی عنایت بھری نظر ڈالی تو ایک پل کے لیے سحر کو اچھا لگا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کچھ سوچ کر کانپ اُٹھی۔ میں نے شہزاد کو اپنی طرف مخاطب کیا جو کہ میرے لیے بھی کوئی آسان کام نہیں تھا، بلکہ اس سے زیادہ مشکل کام مجھے آج تک کوئی نہیں لگا تھا۔ مجھے کپکپی سی ہونے لگی تھی۔ میری سمجھ میں ذرا بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں شہزاد سے کن الفاظ میں حقیقت بیان کروں۔ اپنے پر قابو پاتے ہوئے، میں نے نہایت محتاط انداز سے کہنا شروع کیا۔

''شہزاد، تمہیں میں بتانا چاہتی تھی کہ سحر میری سگی بہن نہیں ہے۔ سحر اور ان کی امّاں قریب کے

دوسرے محلے میں ایک کرایہ کے مکان میں رہتی ہیں۔"

میں رُک رُک کر شہزاد کو ساری بات بتانے لگی۔ یہ سب سن کر شہزاد کہنے لگا۔

"اچھا، میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا تھا کہ یہ آپ کی سگی بہن ہیں۔"

پھر میں نے بات کو بڑھاتے ہوئے اس کو یہ بھی بتا دیا کہ سحر کی امّی میری امّی کو بازار سے سودا سلف لانے میں مدد بھی کرتی ہیں۔

شہزاد نے کہا، "ہاں مجھے تعجب تو ہوا ہی کہ سحر آپ کی سگی بہن نہیں ہیں، لیکن بھلا اس بات کا تعلق میرے اور سحر کے ایک ہونے سے کیا ہے۔ میں سحر کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ یہ سب مجھے بتاتے ہوئے اتنی پریشان کیوں ہیں۔ آپ نے کیا سوچا تھا کہ اگر میں یہ جان جاؤں گا کہ سحر آپ کی بہن نہیں ہے تو میں اس سے دُور ہو جاؤں گا۔ کبھی نہیں۔ میں نے سحر سے محبت کی ہے، باقی کسی بھی چیز کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔"

یہ سب سن کر سحر اسی جگہ پر کھڑی رونے لگی۔ میں نے جلدی سے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر اسے دوسری کرسی پر بٹھانے لگی۔ سحر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس پر تکان اس قدر غالب تھی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی اور اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

فطرت کا ہمیشہ ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ اندھیرے کے بعد اُجالا یقینی ہے۔ وہ کس قدر پریشان تھی۔ اسے لگتا تھا کہ شہزاد یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ کون ہے، اس سے کوسوں دُور چلا جائے گا، مگر یہاں شہزاد کی آنکھوں میں اس نے اسی پل محبت کی اُمڈتی ہوئی بے پناہ لہروں کو دیکھ لیا تھا۔ اسے اپنے ہونے کا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ انہیں لہروں میں گم ہوئی جا رہی تھی۔ سحر کو آج ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شہزاد نے اس کے خالص جذبوں کا بھرم رکھ لیا تھا۔ خاموش آنکھیں اپنی زبان میں شہزاد کا شکریہ اَدا کر رہی تھیں۔

''تم نے مجھے اب ان تمام چیزوں کے ساتھ قبول کرلیا شہزاد۔اب اور مجھے کیا چاہیے، کچھ بھی تو نہیں۔اب تو میں سراپا تمہاری ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ انسان جب منزل کی تلاش میں نکلتا ہے تو اسے صرف تھکن ہی تھکن ملتی ہے۔محبت کی راہوں پر چلنے والوں کے مقدّر میں محض آبلہ پائی ہی ہوتی ہے، لیکن آج......آج تو یہ محبت آبِ حیات بن کر مجھ میں سمائی چلی جارہی ہے۔''

سحر اور شہزاد، دونوں بہت دیر تک خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے اور نگاہوں سے جذب کرتے رہے۔شہزاد کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے رُوبرو تھا اور اس تابنا کی کی قوسِ قزح نے سحر کو اپنی روشنی میں لپیٹ لیا تھا۔اس لمحے شہزاد کی صرف ایک دلکش مسکراہٹ نے سحر سے ہزاروں باتیں کہہ ڈالیں۔سحر کے دل سے ہمیشہ یہ آواز آتی تھی:

''شہزاد میں تمہیں جان جاؤں گی کہ تم کون ہو، جب تمہیں سچائی کا علم ہوجائے گا۔تم کون ہو، واقعی یہ وقت ہی بتائے گا۔اور آج......آج تو تم اپنے امتحان میں بالکل کھرے اُترے۔ مجھے تم پر ہمیشہ سے ہی بھروسا تھا شہزاد۔ میں جانتی تھی، مجھے دل سے یقین تھا کہ تم مجھے کسی حال میں بھی نہیں ٹھکراؤ گے بہرصورت مجھے اپناؤ گے۔''

پھر سحر پر ایک کبھی نہ اُترنے والا نشہ سا طاری ہوگیا۔وہ من ہی من میں آسودہ ہوگئی۔تھکی تھکی سی تو تھی ہی، اب سرمستی کے عالم میں ایک بے خودی سی بھی اس پر چھا گئی۔ایک ایسی عظیم طاقت اس کے دل و دماغ کے اندر اُتری تھی کہ اب ایک ہی پل میں وہ دُنیا کو بالکل دوسرے نظریے سے دیکھنے لگی۔قدرت کی تخلیق کا تماشا تو آئے دن ہوتا رہتا ہے، لیکن سحر نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی سہمی سہمی محبت کی لرزتی ہوئی شاخوں پر یک بیک اس طرح ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں کی بارش ہونے لگے گی اور اس کی محبت کے افسانے کا یہ موڑ اتنا حسین ہوگا۔وہ تو شہزاد کے دل سے اُبھرتی ہوئی محبت اور اس کی فراوانی سے سرشار

ہوتی ہوئی بالکل ساکت کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ قبل ہی تو وہ ایک کچی دیوار کی مانند شہزاد کے سامنے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے ناتواں کھڑی تھی۔ اگر خدانخواستہ شہزاد کا جواب حسب خواہ نہ ہوتا تو اسی پل وہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر جاتی، لیکن اب تو اس کی تمناؤں نے ایک قدم اور آگے بڑھا لیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں شہزاد کو اپنا دائمی ہم سفر تصور کرنے لگی۔ ایک ایسا ہم سفر جو ہمیشہ اس کا ہو کر رہے گا۔ وہ اسی کا سہارا لے کر زندگی کا خوابناک سفر طے کرے گی۔ اسے اب کیا فکر۔ ایک ذرا سی فکر اسے اپنی ماں کی تھی جس کی اجازت اس کے لیے بے حد ضروری تھی لیکن وہ مرحلہ اسے اب اتنا بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو بس اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھنے میں منہمک تھی جس کی مسکراہٹ، جس کی ہر اَدا، بات کرنے کا انداز، اس کے کالے کالے گھنگھریالے بال سب کے سب اس کے دل کے اندر اُترتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی پوری کائنات اس کی نظروں کے سامنے متحرک تھی۔ اس کا چمپئی چہرہ اور بھی نکھرتا چلا جا رہا تھا۔ خوشبوئیں اس کے چاروں طرف منڈلا رہی تھیں۔ اس کے فلمی گانوں کی کتاب کا ایک ایک ورق اپنے اپنے ساز، بول اور نغمہ کے ساتھ اس کی سماعت میں موسیقی گھول رہے تھے۔ فلم کے سین سے بھی زیادہ حسین اور جاں فزا سماں اس کی حقیقی نگاہ کے روبرو جگنوؤں کی طرح جھلملا رہا تھا۔ ایک آخری نگاہ شہزاد پر ڈالتے ہوئے اس نے شرما کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھر دوڑ کر گھر کے اندر بھاگ گئی۔ میں اور شہزاد باہر گھاس پر بچھی ہوئی کرسی پر کچھ دیر تک بیٹھے رہے پھر تھوڑی ہی دیر میں شہزاد بھی وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

اب شہزاد کا ملنا جلنا بڑھتا ہی چلا گیا۔ کبھی لوگوں کے سامنے، تو کبھی باغ کے کسی کونے میں موقع ملتے ہی دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ ختم ہونے والی باتوں میں اُلجھے رہتے اور ایک دوسرے پر نچھاور ہوتے رہتے۔ ایک دن سحر، شہزاد سے ملنے باغ میں چلی گئی۔ کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے، شہزاد

کی یہ خواہش تھی کہ سحر اس کے پاس کچھ دیر اور ٹھہرے لیکن سحر کے سر پر چوبیس گھنٹے ایک تلوار لٹکی رہتی تھی یعنی ماں کا ڈر۔ آس پاس کے لوگوں کا ڈر تھا کہ کہیں کوئی اسے شہزاد کے ساتھ دیکھ نہ لے۔ اس لیے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگنے کے موقعے تلاش کرنے لگی، جانے کے بہانے بنانے لگی۔ شہزاد کو جیسے ہی اس بات کا اندازہ ہوا کہ سحر اب یہاں سے بھاگنے والی ہے تو جھٹ سے اس نے اس کا دوپٹہ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

''سحر، میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گا۔''

سحر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا بھی دل کب چاہ رہا تھا کہ وہ شہزاد کو چھوڑ کر گھر چلی جائے۔ اسے تو شہزاد کی قربت سے ایک سکون حاصل ہو رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے تاحدِ نظر پھول ہی پھول کھل اُٹھے تھے۔ وہ ایک انوکھے جذبات کی رو میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی پلکوں پہ ستارے جگمگانے لگتے اور کبھی پروائی کے سنگ خندۂ گل کے موسم کی خوشبو کے آتے ہی وہ مسکرانے لگتی تو ایسے میں اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا۔ بیلا، چنبیلی اور رات کی رانی اس کے آنچل کو تھام کر اس کے اس حسین سفر میں اس کا ساتھ دینے لگتیں۔ اُونچے اُونچے درختوں پر چڑھتی ہوئی ہری ہری بیلوں کی ٹھنڈک اور رنگ برنگے پھولوں کے سائے میں اپنے محبوب کے ساتھ چند انمول پل گزار کر بے خودی میں ڈوبی ہوئی اس راج کماری پر سونے چاندی کے افشاں کی پھواریں برسنے لگتیں، لیکن دوسرے ہی پل جیسے ہی اسے یہ خیال آتا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کس کے ساتھ ہے تو وہ سوچتی:

''کاش میرے محبوب کے ساتھ ان حسین لمحوں کو بتانے کے لیے کوئی مجھے بالکل ہی آزاد چھوڑ دیتا تاکہ میں بے خوف و خطر جذبوں کے فلک پر اُڑان بھرتی رہتی، کاش میں ان درختوں کی چھاؤں میں شہزاد کے ساتھ عمر گزار لیتی۔''

لیکن وہ شہزاد کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ کہیں دور لاؤڈ اسپیکر سے کسی فلمی نغمے کی موسیقی شروع ہوئی جس نے اس کے بڑھتے قدموں کو جکڑ لیا۔ اسے پتہ چل گیا کہ اب کون سا نغمہ شروع ہونے والا ہے (سحر فلمی نغموں کی اس قدر شائق تھی کہ دھن شروع ہوتے ہی اسے پتہ چل جاتا تھا کہ یہ کون سا نغمہ ہے) وہ میوزک کے شروع ہوتے ہی پھر سے شہزاد کی بانہوں میں سماتی چلی گئی۔ اس گانے کے بول رقص کرتے ہوئے مدھر تال پر اس کے روم روم میں سمانے گے:

میرے ہم سفر...... میرے ہم سفر

میرے پاس آ...... میرے پاس آ

ہمیں ساتھ چلنا ہے عمر بھر

میرے ساتھ آ...... میرے ساتھ آ

ہے سفر ہمارا نیا نیا...... کسی پل اندھیرا جو ہو گیا

کہیں کھو نہ جائے یہ رہ گزر

ہمیں ساتھ چلنا ہے عمر بھر

میرے ساتھ آ...... میرے ساتھ آ

اس نے سر اُٹھا کر اُوپر کی طرف دیکھا۔ باغ میں جہاں وہ ایک درخت کے نیچے شہزاد کا سہارا لے کر کھڑی تھی، اس درخت کے پتے پتے ہزاروں ہزار آئینوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان آئینوں کی چمک میں شہزاد کا چہرہ جگمگانے لگا۔ کائنات رقص کرنے لگی۔ ایسے سماں میں کسے یاد رہ سکتا تھا کہ کہاں حویلی ہے، کہاں حویلی کے سب لوگ اور کہاں اس کی امّاں ہیں۔

وہ بے خود سی سب کچھ بھول کر اس پل میں ڈوبتی چلی گئی۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا وہ کون ہے،

کدھر ہے اور کہاں ہے۔ چند لمحوں کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ چونک اُٹھی۔

''اماں مجھے تلاش کر رہی ہوں گی شہزاد! مجھے جلد از جلد حویلی میں واپس جانا ہے۔''

شہزاد، سحر کی خمار آلود نظروں کی ساری خوشیوں کے جوہر کو کوٹ کوٹ کر اپنے دل میں بھرتا گیا اور پھر اسے بے پایاں خوشی حاصل ہوئی۔ محبت کے اس کرشمے کو محسوس کر کے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اب کچھ اور چاہیے ہی نہیں۔ سحر کی محبت شہزاد کے اندر جیسے سانس بن کر سما گئی تھی۔ شہزاد کی بانہوں سے نکلنا سحر کے لیے جتنا تکلیف دہ تھا، اتنا ہی شہزاد کے لیے بھی اذیت ناک تھا۔ اس کے دل نے دہائی دی...... اب تم کو ہمیشہ کے لیے پاس لانا ہے!

اب شہزاد کو ایک بہت ہی بڑا کام کرنا تھا۔ آج اسے اپنے والدین کو ساری ہی باتیں بتا دینی تھیں۔ سحر کی آنکھوں میں خوابوں کے جو قافلے اس نے اُترتے دیکھے تھے آج ان کی تعبیر اُبھرنے والی تھی۔ سحر کی آنکھوں کا اُجالا اس کے اِردگرد منڈلانے لگا۔ وہ بالکل خاموش تھا، لیکن اس کی نظریں یہی کہہ رہی تھیں:

''سحر تم بالکل گھبرانا نہیں۔ میرے ماں باپ بہت اچھے ہیں۔ وہ تمہیں سینے سے لگا لیں گے۔ سحر، تم انہیں نہیں جانتی ہو، میں بس گیا اور واپس آیا۔ تم میرا انتظار کرنا۔ آج تو ہم دونوں کی تقدیر کا ایک بہت ہی خوب صورت فیصلہ ہوگا۔ تم جو مہینوں سے تکیے میں منہ چھپا کر اپنے آنسوؤں کو جذب کرتی رہی ہو وہ ایک ماضی تھا سحر، اب میں تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔ دُنیا کی کوئی طاقت اب مجھے اور تمہیں جدا نہیں کر سکتی۔ تم سے بات کرتا ہوں تو ایسا سکون حاصل ہوتا ہے جیسے زندگی کی کڑی دھوپ میں درخت کا گھنا سایہ، لیکن دیکھو تم مجھ سے کبھی رُوٹھا نہ کرو۔''

سحر کو شہزاد کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب ماں کی باتیں کان میں گونجنے لگیں۔

''کا (کیا) سحر، اتنا اُونچا گھر کی طرف دیکھے کی جرورت (ضرورت) تھی۔ کا سوچو ہو، ہواں (وہاں)

کا تورے کوئی اِجّت (عزت) ملے گی۔ میری ٹوٹی ڈیوڑھی سے کا (کیا) لے کے او محل میں جاؤ گی۔''

اور اسی طرح کے خیالات سے سحر کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر وہ ماں کو کس طرح بتائے گی کہ شہزاد اس سے شادی کرنے کو تیار ہے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ شہزاد اپنے گھر گیا اور ماں باپ دونوں کے سامنے اپنی رُوداد پیش کر دی۔ دونوں نے خاموشی سے اس کی باتیں سنیں اور اس کے پاپا نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا کہ:

''شہزاد، اس کا فیصلہ کہ تم وہاں شادی کر سکتے ہو یا نہیں، میں تمہیں کل صبح سویرے بتاؤں گا۔''

شہزاد نے بغاوت آمیز لہجے میں جواب دیا، ''پاپا فیصلہ تو میں کر چکا ہوں۔ شادی تو مجھے سحر سے ہی کرنی ہے۔ میں تو صرف آپ لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے آیا تھا۔''

''ہم دونوں کو شہزاد، اطلاع دینے کی بھی کیا ضرورت تھی''۔ اس کے پاپا نے بے رُخی سے کہا، ''اگر تم یک بیک اس قدر خودسر ہو گئے ہو تو پھر میں اس کے آگے تم سے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''

شہزاد کے گھر کا ماحول منٹوں میں بدل گیا۔ شہزاد پھر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر مزید اس نے گفتگو کو آگے بڑھایا تو اس کے ہی حق میں برا ہو گا۔ فی الحال اس نے خاموش ہی رہنے میں اپنا بھلا جانا۔

شام کے وقت یک بیک خاور شوق صاحب کے گھر سے فون آیا کہ وہ دونوں میاں بیوی امّی سے آ کر ملنا چاہتے ہیں۔ میرا دل بہت گھبرانے لگا۔ سحر تو مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھی۔ میں اسے سمجھانے لگی۔

''سحر، ہو سکتا ہے وہ لوگ بات پکّی کرنے کو آ رہے ہوں۔''

مغرب سے ذرا پہلے دونوں میاں بیوی ہم لوگوں کے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی امّی کو سلام کر کے کہا کہ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ امّی ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے کر چلی گئیں۔

سحر کی امّاں دالان میں تخت پر بیٹھی پاندان کھول کر پان کی کھلیاں لگا رہی تھیں۔ ایک تازی تازی

کھلی منھ میں ڈالی تھی اور دوسری کھلی ان کی پتلی پتلی کتھے کے رنگ میں رنگی اُنگلیوں کے ہی بیچ اُلٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ خاور شوق صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھ کر مجھ سے آہستہ سے پوچھنے لگیں۔

''اجی ای (یہ) کون ہیں جی۔''

میں نے اشارے میں بہت آہستہ سے کہا کہ یہیں پاس میں رہتی ہیں۔

سحر اس وقت باورچی خانے میں کہیں چھپ کر بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شہزاد کے ماں باپ امّی سے ملنے آرہے ہیں۔ سحر کی اماں آہستہ آہستہ بولے جارہی تھیں۔

''ہائے ہم تو ان کو کبھی نا دیکھا۔ آج ایک دم دھڑلے سے کیسے آ گئے''

میں نے صرف اپنے دونوں شانوں کو اُچکا دیا اور پھر خاموش رہی۔ مجھے یوں بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی کیونکہ ان لوگوں کی باتیں ڈرائنگ روم سے بالکل صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔ شہزاد کی امّی کہہ رہی تھیں۔

''بھلا آپ ہی بتائیے، یہ آپ کے گھر کی دائی کی لڑکی سے میں اپنے بیٹے کی شادی رچادوں؟''

بتولن بی نے اشارے سے ہاتھ گھما کر مجھ سے پوچھا،''کون دائی؟''

میں بالکل خاموش رہی۔

''ہم لوگ سیّد خاندان سے ہیں اور شریف لوگ ہیں۔ وہ سحر خود کو سمجھتی کیا ہے۔ اسے اپنی اوقات کا اندازہ نہیں ہے۔''

امّی کو اب پوری طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ دراصل معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

''دیکھیے شریف تو وہ لوگ بھی ہیں اور ذات کے سیّد بھی۔''

امّی کو خود ہی پتہ نہیں تھا کہ ایک زمانے سے اس گھر میں کیسی کھچڑی پک رہی ہے۔ امّی کے

پریشان لہجے کو میں دالان کے تخت پر بیٹھی محسوس کر رہی تھی۔

شہزاد کی امّی نے پھر کہا، ''یہ تو بالکل پھنسانے والی بات ہے۔ غریب گھر کی لڑکیوں کو ان کے ماں باپ بھی یوں ہی بے لگام چھوڑ دیتے ہیں تاکہ امیر معصوم لڑکوں کو وہ اپنے حُسن کے جال میں پھنسا کر حویلیوں میں راج کریں۔''

امّی یہ سب سُن کر سکتے میں آ گئیں، لیکن کچھ پل سنبھلنے کے بعد پھر بولیں۔

''مجھے خود بھی اس واقعے کا کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے تو یہ سب آپ سے پتہ چل رہا ہے لیکن میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ یہ لوگ بہت ہی اچھے لوگ ہیں اور شریف خاندان سے ہیں، لیکن تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے اب ان کے سامنے ایسا وقت لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہی ہے کہ کل جو بنگلہ اور کاروبار کی مالکن تھیں، آج میرے گھر کا سودا سلف لاتی ہیں۔ آپ مہربانی کر کے بتولن بی کے لیے دائی کا لفظ استعمال نہ کریں۔''

بتولن بی نے ساری باتیں سُن لی تھیں اور بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ ان کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا اور ایک ہی لمحے میں جیسے ساری باتیں حقیقت بن کر ان کے سامنے ناچنے لگیں۔ میں نے بتولن بی کو گلے سے لگا لیا جو کہ بالکل بے جان اور نڈھال ہو رہی تھیں۔ ان کے آنچل کے چونے کتھے اور عطر کی پاکیزہ خوشبوؤں کو میں اپنے آنسوؤں سے تر کرنے لگی۔ غربت کی اس خوشبو نے میرے اندر ایک ایسا واویلا برپا کر دیا کہ بتولن بی کے ساتھ میں بھی بے جان سی ہونے لگی۔ ان کا درد اتنا شدید تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی تڑپ رہی تھی۔ مجھے تو اس وقت سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ان کے دُکھ کو ان کے آنچل سے جھاڑ ڈالوں۔ مجھے سحر پر اسی پل بہت غصّہ آنے لگا......

''سحر تم نے اپنی محبت کی پینگ کو اس قدر بڑھایا کہ ایسے ناخوش گوار حالات آج پیدا ہو گئے۔

بتولن بی کی اتنی رُسوائی کو تم اپنے کاندھے پر کس طرح ڈھوتی رہو گی۔"

میں اس ضعیف اور ناتواں خاتون کو اپنے سینے سے لگائے رہی جو ہماری تہذیب کا شاہکار تھیں، جن کی زبان سے اَدا کیے ہوئے ایک ایک جملے سے مجھے محبت تھی، جن کے بات کرنے کے نرالے انداز پر میں دن رات فدا ہوتی رہتی تھی۔ ایسے ہی حالات اور قسمت کی ستم ظریفی سے ان کا دل پاش پاش ہو چکا تھا، لیکن انہوں نے نہایت صبر اور برداشت سے خود کو سنبھالے رکھا تھا تاکہ سحر کی اچھی پرورش کر سکیں، لیکن اب سحر کی وجہ سے آئی ہوئی آزمائش نے انہیں ہلا ڈالا تھا۔ ان کے صبر کے پتھر کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھ کر میں تڑپ اُٹھی لیکن میں ڈرائنگ روم میں جاتی بھی کس طرح؟ اور اگر میں اُٹھ کر چلی جاتی تو بتولن بی کو سنبھالتا کون؟ میں ان کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ان سے کہا۔

"چلیے، کمرے میں لیٹ جائیے ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

میں بتولن بی کو وہاں سے ہٹانا چاہتی تھی تاکہ شہزاد کے ماں باپ جب کمرے سے نکل کر جانے لگیں تو بتولن بی سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہو۔

بتولن بی اپنے کمزور جسم کو بہ مشکل اُٹھا کر اور میرا ہلکا سا سہارا لے کر کمرے کی طرف چلنے لگیں۔

"ہائے ای (یہ) کا کیو میری بابو، میری سحر۔ اتنا بڑا دُکھ دیوے (دینے) کو جنم لیو (لیا) تھا میری بابو!"

ان کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ میرے بھی دل و دماغ کی صلاحیت جیسے بہتی چلی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے سحر اور بتولن بی کو چھوٹا اور حقیر دکھا کر مجھے بے حد افسردہ کر دیا تھا۔ بالکل ایسا لگنے لگا کہ جیسے ہم سبھی ان بڑے لوگوں کے سامنے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

میں نے بتولن بی کو کمرے میں لا کر امّی کے بستر پر لٹا دیا اور آہستہ آہستہ ان کا سر دباتی رہی۔ وہ بہت دیر تک خاموشی سے بستر پر لیٹی رہیں اور آہستہ آہستہ آنسو بہاتی رہیں۔ میں مستقل ہی ان کے سرہانے بیٹھی

رہی۔ خاور شوق صاحب اور ان کی بیوی یعنی سماج کے نام نہاد رکھوالوں کو تو اس بات کا علم ہونا چاہیے تھا کہ کسی کی عزّت کا مذاق اس طرح سے نہیں اُڑایا جاتا ہے۔ یوں تو کہنے کو یہ لوگ نہایت ہی علم دوست اور وسیع النظر تھے، تہذیبی اور فکری قدروں کو اپنی باتوں میں پیوست کر کے آس پاس کے لوگوں کو کافی متاثر اور مرعوب بھی کر چکے تھے، لیکن ان کی حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ گھر سے باہر نکلتے تو ہر طرف سے سلام بابو، سلام بابو کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ ان کے اطراف کے سارے گھر کچے مکانوں کے تھے۔ صرف ان کی ہی کوٹھی عالیشان تھی جہاں عیش و عشرت کے ساتھ یہ لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس محلّے کے چھ سات غریب لوگ ان کے گھر کے ملازم تھے جو رات دن ان کی جوتیوں کو سیدھا کرتے رہتے تھے اور یہ چند سکّوں میں ان غریبوں سے اپنی خدمت کرواتے نہ تھکتے تھے۔

ہم لوگوں کے گھر سے جا کر خاور شوق صاحب نے اپنے بیڈروم کے دریچے سے ان خستہ حال مکانوں اور ان کے مکینوں پر ایک اُچٹتی سی نظر دوڑائی اور اسی پل انہیں ایک عجیب کراہیت سی محسوس ہونے لگی۔

"کیا میرے اکلوتے لڑکے کی دُلہن انہیں ٹوٹے پھوٹے مکانوں سے نکل کر میرے اس عالیشان محل میں آجائے گی؟ کیا وہ میری بہو بن کر میری نسل چلائے گی؟ پھر میرے خاندان اور حسب نسب کا کیا ہوگا؟"

وہ ایسے خیال سے بھی کانپنے لگے۔

چہرے پر قیمتی سنہری عینک، روپہلی نازک سی زنجیر سے بندھی ہوئی خوب صورت گول گھڑی جوان کے قمیض کے اُوپری جیب میں ہمیشہ رہتی، جسے وہ ہر تھوڑی دیر پر نکال نکال کر وقت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ آج پریشان ہو ہو کر گھڑی کچھ زیادہ ہی دیکھ رہے تھے۔ پیلی دھاری والی انگلینڈ سے منگوائی ہوئی قمیض پر ہمیشہ Suspenders چڑھا لیتے، لیکن آج اپنے دونوں ہاتھوں سے Suspenders میں اپنا

انگوٹھا پھنسا کر کمرے میں بے بسی سے ٹہل رہے تھے۔

خاور شوق صاحب معاشرے کے ان لوگوں میں سے تھے جو معاشرے کے اچھے بُرے عمل، انصاف اور بے انصافی پر بھرپور تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی دلکش تھا اور لہجہ بھی نرم تھا بلکہ من موہ لینے والا تھا۔ غریب پرور بھی کہلاتے تھے۔

غریبوں میں کھڑے ہو کر یہ بتاتے تھے کہ اسلام مساوات اور دردمندی کا مذہب ہے۔ اپنے پُر اثر الفاظ میں لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ سارے انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں اور سب کا خدا ایک ہے، لیکن معاملات میں جہاں اپنے رُتبے کی بات سامنے آجاتی تھی تو پھر وہی لوگ اس صفائی سے مُکر جاتے تھے کہ بس آپ اپنا سا منھ لے کر رہ جائیں۔ اس محلّے کے غریب لوگ اپنے روز و شب کو کسی طرح سے ایک کیڑے مکوڑے کی طرح گزار رہے تھے۔ بے اطمینانی، ہیجان، پریشانی اور غیر یقینی حالات میں سانس لے رہے تھے۔ وہ تو یہ سب جانتے تھے لیکن کبھی بھی اپنی طرف سے کوئی ٹھوس قدم ان کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں اُٹھایا کہ ان لوگوں کا بھلا ہو سکے۔ واقعی ایسے لوگوں کے لیے تو یہ ایک بہت ہی بڑی بات تھی کہ سحر جیسی غریب لڑکی سے شہزاد کی شادی کر دی جائے۔

یہی لوگ جو اپنی تقریروں میں سماج کی تعمیر و تشکیل کے لیے لفظوں کے دریا بہا دیتے تھے، جب امتحان کا سامنا انہیں خود کرنا پڑا، ساری پول کھل گئی۔ اپنی زندگی کے اس امتحان میں ان کی سوچ کا جمالیاتی ذوق جیسے کافور ہو گیا۔ ان کے ہونٹوں کی وہ پُر وقار مسکراہٹ، جس سے وہ ہزاروں لاکھوں کا دل موہ لیتے تھے، اس کی بدصورتی میرے سامنے نمایاں ہو چکی تھی۔ ان کی عقل مندی اور دانش وری کی مالا تو پل بھر میں ہمارے ڈرائنگ روم کی پکّی زمین پر بکھر کر رہ گئی تھی۔ روشن دان سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی آڑی ترچھی روشنیوں میں کھڑے کھڑے وہ جیسے مکمل طور پر عریاں ہو گئے۔

کسی کے چراغ کو جلا دینے سے کیا ان کے چراغ کی روشنی کم ہو جاتی؟ نہیں، بالکل نہیں، کبھی نہیں، بلکہ وہ روشنی تو اور بھی بڑھ جاتی، لیکن انہیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ اس کے کیسے کیسے کرشمے ہیں۔

شہزاد کے گھر کا ماحول کچھ اس طرح سے بدل گیا تھا کہ اسے اب وحشت ہونے لگی۔ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میری ماں، میری پسند اور میری محبت کی محافظ بن کر سب کے سامنے آ جائیں گی، لیکن انہوں نے تو اسے بالکل دلگیر کر کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچتا......

''بے شک وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتیں، مجھ سے سوالات کرتیں، میری سنتیں، لیکن اس آسانی سے صرف ایک لفظ 'نہیں' کہہ کر ایک دم سے میری زندگی کو ختم کر دینے کے لیے فیصلہ تو نہ کرتیں۔''

شہزاد کو اپنی ماں کو منانے کا کوئی بھی راستہ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس طرح سے اس کا پورا وجود سحر کی محبت میں شرابور ہو چکا تھا، وہ بہ آسانی یہ کہہ دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا کہ...... ''پھر ٹھیک ہے، میں اپنا راستہ لوں اور آپ لوگ اپنی راہ لیں''۔ لیکن پھر بھی اس نے کئی بار کوششیں کیں کہ یہ لوگ خوشی خوشی راضی ہو جائیں تو وہ سحر کو پوری عزّت اور وقار کے ساتھ بیاہ کر گھر لائے۔ ورنہ دُنیا میں بہت سے ٹھکانے ہیں۔

ادھر شہزاد کے ابا اپنے کشادہ لان میں سر جھکا کر ٹہلنے لگے اور شہزاد کو کوئی بھی فیصلہ کن قدم اُٹھانے سے باز رکھنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ انہوں نے تو اپنی زندگی میں پہلے کبھی بھی اتنی بے بسی نہیں محسوس کی تھی۔ وہ باطنی طور پر جو خود تھے، اسے لوگوں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے اس وقت اپنی شخصیت کو، اپنے امیج کو برقرار رکھنا انہیں بہت مشکل لگ رہا تھا۔ اس لیے بیٹے سے اس جنگ کو لڑنے میں انہیں بے شمار دُشواریوں کا سامنا کرنا تھا۔ وہ جلدی جلدی ٹہلتے ہوئے یہی سوچ رہے تھے کہ آخر اس لڑکے کے دماغ کو کس طرح صحیح کیا جائے۔ انہیں یہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح شہزاد کو

سمجھائیں کہ اس کا انتخاب بالکل غلط ہے اور وہ لڑکی ان کے گھر کے اور خود شہزاد کے قابل ہے ہی نہیں۔

وہ بے حد ڈرے ہوئے تھے اور انہیں جلد ہی کوئی ٹھوس قدم بھی اُٹھانا تھا۔ بس یہی خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا تھا کہ ذرا سی غفلت ان کے وقار اور عزّت کو پوری طرح سے برباد نہ کر دے۔ اس خیال نے ان کو اتنا مجبور اور بے بس بنا دیا تھا کہ انہیں سکون کی سانس لینا مشکل لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ دل و جان سے شہزاد کو سحر سے الگ کر دینے کے در پے ہو گئے۔

اس ناگہانی مصیبت میں دونوں میاں بیوی اس قدر پریشان ہو گئے تھے کہ انہیں اس جال سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دلاسا دیتے رہے، مگر یہ دلاسے...... یہ دلاسے اس قیامت کی گھڑی میں ان کے کیا کام آتے۔ ان کے لیے یہ وقت تو بس ایک ایسا وقت تھا جب وہ ایک جابر حاکم کی طرح ایک حکم صادر کر دینا چاہتے تھے:

''خبردار جو کسی ایسی جرأت کے لیے کوئی بھی قدم اُٹھایا۔''

اور پھر ایک ایک آدمی حاکمِ وقت کے آگے اپنا سر جھکائے کھڑا ہو جائے اور یہ کہہ دے کہ ''جو حکم سرکار کا!''

لیکن یہاں تو معاملہ محبت کا تھا۔ محبت کرنے والے جب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو پروردگار کی لاجواب جنت کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔ محبت تو در حقیقت ایک احساسِ زندگی کا نام ہے اور مر جانے کے بعد کیا محبت ختم ہو جاتی ہے؟ کبھی نہیں۔ اس کے کرشمے تو رہتی دُنیا تک یاد کیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی بھولتا نہیں، بلکہ ان لازوال محبتوں کا حوالہ دے کر مضمون لکھے جاتے ہیں، کہانیاں بیان کی جاتی ہیں، افسانے تیار ہوتے ہیں اور پھر ایک سچے عاشق کے اس طرح مر جانے پر لوگ آنسو بہاتے، سر دھنتے اور ایک خاص کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

شہزاد نے ماں اور باپ سے اپنی جھولی پھیلا کر اپنی قلبی خوشی کی بھیک مانگی اور رو رو کر گڑ گڑا کر منتیں کیں لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ماں بھی زور زور سے شہزاد کے سامنے رونے لگیں اور کہنے لگیں۔

''تجھے میں نے جھولی پھیلا کر خدا سے اسی دن کے لیے مانگا تھا شہزاد کہ تُو ایک دن نوکرانی کی لڑکی بیاہ کر میرے آگے، میرے برابر کھڑا کر دے گا؟''

ماں اور باپ دونوں ہی نے صاف صاف لفظوں میں یہ ظاہر کر دیا کہ:

''تم سحر سے شادی کر کے دیکھ لو۔ ہم بھی تمہارا مرتے دم تک منہ نہیں دیکھیں گے۔ پھر اس کے بعد سوچیں گے کہ جئیں یا مر جائیں۔''

شہزاد کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک عجیب دوراہے پر کھڑا اپنے ماں باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ باپ نے سحر سے شادی کرنے کی صورت میں عاق کرنے کی دھمکی دی اور ماں نے اسے دودھ کا قرض معاف نہ کرانے اور اپنے جنازے کو کندھا نہ دینے کی قسم دے دی۔ ایک جانب اس کی جانِ حیات تھی تو دوسری جانب منزل و مقصدِ حیات۔ ایک طرف والدین کی لازوال شفقتیں تھیں تو دوسری طرف حیات کو جاودانی بخشنے والے جذبات۔ شہزاد کو اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ بار بار سحر کا اُمید و نا اُمیدی میں ڈُوبا ہوا چہرہ نظر آتا۔ وہ حسین چہرہ، جس نے اسے محسوسات کے ایک نئے جہان سے آشنا کرایا تھا۔ اس کا دل احتجاج کرنے لگا۔ طبقاتی تفریق میں کہے جانے والے اس کے الفاظ کیا یونہی اپنے معانی کھو دیں گے؟ کیا ایک اور محبت سماج کے کھوکھلے رسم و رواج پر قربان ہو جائے گی؟ دماغ الگ ملامت کر رہا تھا۔ کیا ں ماں باپ کی پچیس سالہ محبت و شفقت اور قربانی رائیگاں جائے گی؟ ماں کی صرف یک شب بیداری کیا محبوب کی اختر شماری کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

شہزاد بے بسی کی انتہاؤں پر تھا۔

شہزاد، سحر کی افسردہ آنکھوں کو تصور میں لاتا تو کانپ جاتا۔ سحر تو ایک پیکرِ مہر و وفا بنی شہزاد کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ماں باپ سوسائٹی کے نام نہاد دانشور تھے جو معاشی، مذہبی اور سماجی تعمیر کا بہ زعم خود ٹھیکہ لیے باوقار انسان بنے ہوئے تھے، لیکن سحر بھی تو اس سرزمین پر اپنا ایک وجود رکھتی تھی۔ وہ بھی اپنی بوڑھی ماں کی دیکھ ریکھ اور دیگر دُنیاوی فرائض اپنی صلاحیت کے مطابق اَدا کر رہی تھی۔ اگر اس نے شہزاد سے عشق کیا بھی تو کیا ہوا؟ وہ تو اس کا حق تھا۔ عورت کا عشق کرنا کیا کوئی بُری بات ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ بس شرط صرف یہ ہونی چاہیے کہ وہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ اور وہ لڑکی تو بہت ہی نفاست پسند تھی، عقلمند تھی اور علم و ہنر کو اپنے آپ میں ایسے جذب کر لیتی تھی کہ لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ بھی اپنے دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اعلیٰ ترین معیاری زندگی گزارے گی۔ اور کیوں نہیں، ایک انسان کو جینے کے لیے جن قدروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سارے اقدار اُس میں موجود تھے۔ وہ چاہتی تو اپنی محبت کا اعتراف کرنے سے بھی ڈر جاتی۔ اس کے اندر زمانے کا خوف تو تھا لیکن اس میں جراُتِ عشق کا جذبہ بھی موجود تھا اور فی الحال وہ اسی جراُت کی سزا کاٹ رہی تھی۔

وہ تو بڑی شائستگی اور ہنرمندی سے ہر اچھے اصولوں اور طریقوں پر چلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے اچھے اور بُرے کی تمیز تو خود اس کے ماں باپ نے سکھائی تھی۔ میرے ابا جب دالان میں اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر ہم لوگوں کے سامنے کسی شعر کی تشریح کرتے اور اس کی تہہ داری کی طرف اشارہ کرتے تو وہ بھی بڑے غور سے سنتی اور اس کی قندیل جیسی آنکھیں شعر سمجھ کر اور بھی روشن ہو جاتیں اور وہ مسکرانے لگتی۔ ہم لوگوں سے زیادہ اسے ایسی محفلوں کا انتظار رہتا۔ وہ منتظر رہتی کہ کب ابا آئیں گے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ہم لوگوں کو اُردو پڑھانا شروع کریں گے۔

لیکن وقت نے سحر کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ جہاں انسان گم ہو جاتا ہے۔اس کی بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت شہزاد کی طرح ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ماں نے کہہ دیا تھا:

''دیکھو سحر! اِجّت (عزّت) اگر چلی گئی تو تورے (تمہارے) پاس کچھ نہ بچا بیٹا...... اور او (وہ) تو چلی ہی گئی، اب اور کا بچا، سب تو ماٹی میں ملا ہی چکی ہو۔''

اور پھر زور سے رونے لگتیں، ''ارے صاحب، ای سب میرے کرم کا لکھا تھا جبور (حضور)۔آپ نے تو بہت اِجّت دیا، مگر ای مہارانی سب کچھ روند کے چلی آئیں۔''

جب وہ اس طرح بولنے لگتیں تو ہم بھی خاموش ہو جاتے۔ وہ کیا کر رہی تھیں، اپنے دل کی بھڑاس ہی تو نکال رہی تھیں، جو کہ ان کے لیے ضروری بھی تھا۔

''جاؤ نا، جاؤ سہرا باندھ کے اپنے سے چلی جاؤ۔تورے اِجّت (عزّت) ملے نا ملے، مان ملے نا ملے، مان نہ مان ہم تورے (تمہارے) مہمان۔''

اور سحر وہیں پر بیٹھی ماں کی باتوں کو سنتی رہتی اور بدستور آنسو بہاتی جاتی۔اور وہ کرتی بھی کیا۔ ایک مجبور لڑکی کر بھی کیا سکتی ہے۔ وہ تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس مقام پر پہنچ گئی تھی۔اس کی نظروں نے شہزاد کی موہنی صورت کو پسند کیا، دل نے شہزاد کی طلب کی اور وہ اس پر فدا ہو گئی۔محبت کرنا جرم نہیں ہے، لیکن محبت میں محبوب کے حصول کی خواہش گناہ ہے، کیونکہ دل کے ضابطے اور دُنیا کے اصول دونوں کے سرے کبھی نہیں ملتے۔سحر تو دل کے جذبوں کو جانتی تھی، دُنیا کی رسموں سے اب آشنا ہو رہی تھی۔ دل کی عدالت میں محبوب حاکم ہے لیکن سماج کے بنائے ہوئے قوانین اسے ایک نوکر، خادمہ، دائی کے ساتھ ساتھ ایک لالچی غریب بھی ثابت کر رہے تھے۔ اس کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ ماں کی دُہائیاں الگ کلیجے میں تیر کی طرح لگ رہی تھیں۔ایک گہرا سکوت اس کے چہرے پر طاری تھا۔نہ کوئی

حرکت، نہ جنبش۔

اب ماں نے سحر کے سارے لمحوں پر کڑی پابندیاں لگا دی تھیں۔

''کہاں جا رہی ہو جی...... کھڑکی کے پاس سے ہٹو...... گھر جائے کا، ای گھڑی (اس وقت) جرورت نا ہے......'' وغیرہ وغیرہ۔

میں سوچنے لگی کہ وقت اور زندگی کے کرشموں اور اس کی کشاکش میں انسان کتنا بدل جاتا ہے۔ سحر بھی بے پناہ بدل چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل ایسی لگ رہی تھیں جیسے بل کھاتی ندیا کا پانی اچانک ٹھہر جائے۔ ایک تو بتولن بی اسے زیادہ اِدھر اُدھر جانے نہیں دیتیں اور اگر ہم لوگوں کے گھر سے نکل کر اپنی گلی کی طرف جانے کا ارادہ بھی کرتی تو کسی اور ہی طرف مُڑ جاتی۔ پھر جب ہوش آتا تو وہاں سے مُڑ کر اپنے گھر کا صحیح راستہ پکڑتی۔ لگتا تھا جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح وہ اپنے گھر کا راستہ بھول چکی ہے۔ دن بھر کے شور وغل اور تھوڑا بہت کام کاج میں وقت کسی طرح گزر جاتا لیکن رات میں اپنی اوڑھنی میں آنسوؤں کو جذب کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا۔

بھلا دل کی گہرائی سے اُبلتے ہوئے سمندر کو اپنے دوپٹے کی تہوں میں چھپانا کوئی آسان کام تھا۔ وہ اس عشق کو اپنے دل میں بسا چکی تھی کہ اب اسے بھولنے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا۔ یہ راستہ بھی کچھ عجیب راستہ تھا۔ اس راستے پر چلتے چلتے تو اس کی منزل ہی جیسے کھو چکی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ میں اس کی ہم راز، اس کی پکّی سہیلی ہوں۔ ایک طرح سے اس کی محبت کی پوری طرح سے محافظ بھی تھی، لیکن شہزاد کے والدین کے اس طرح سے یک بیک گھر میں داخل ہو جانے کے بعد جو راز فاش ہوا اور ان کے انداز گفتگو سے گھر میں جیسی بدمزگی اور رُسوائی پیدا ہوئی، تو میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ صرف ایک تماش بین بنی رہی۔ میرے کمرے میں آکر سحر بہت روئی۔ میں نے اس کو چپ کرانے کی

کوشش بھی نہیں کی۔ رونے سے اس کے مسئلے کا حل تو نکلنے والا نہیں تھا، البتہ رو کر اس کے دل کا بخار ضرور نکل رہا تھا۔ جی بھر کر رو لینے کے بعد وہ پرانی باتوں کو یاد کرنے لگی۔ میں نے تو اس کی روداد پہلے بھی سنی تھی لیکن اس نے اپنی ساری روداد از سرِ نو سنانی شروع کی۔

سحر کو مذہب اور سماج کے اصولوں کے سبق یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے جو اس کی ماں نے مغرب کی نماز کے بعد آنگن کے کچے چولہے پر کھانا پکاتے ہوئے جلتی لکڑیوں کی روشنی میں اسے سکھائے تھے۔ زندگی کے جتنے بھی رُخ ہیں، ان سے تعلق رکھنے والے سارے سوالوں کے جوابات اسے اپنی ماں کی باتوں میں پوشیدہ نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کو غور سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کی اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں:

''دیکھو بابو، مصیبت اکیلے نا آوے ہے...... اسی لیے کہے ہیں میاں، کی دھیان سے چلو۔ خالی اوپر مت دیکھو۔ داہنے دیکھو، بائیں دیکھو، نیچے دیکھو، تب چلو۔ ای دُنیا جنگل ہے۔ بٹی ہیاں (یہاں) طرح طرح کا جناور رہے ہے۔ کا توری مت ماری گئی تھی جو توں (تم) بھری رات میں، ای بھلا اندھیری گلی میں، حویلی سے اکیلی چلی آئی۔ تورا (تمہارا) دماگ (دماغ) چڑے گیا تھا۔ ہوش میں رہا کرو سحر......''

وہ اپنی ماں کی ان ساری باتوں کو سن کر بھی کیسے بھٹک گئی۔ اسے احساس تو تھا کہ وہ بھٹک رہی ہے لیکن کسی کو چاہنے کی خواہش اس کے اندر کے اس خوف پر حاوی ہوگئی۔ محبت کے ہاتھوں مجبور خوشبوؤں کا ہاتھ تھامے فضاؤں میں لہراتی رہی لیکن حقیقت کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر وہیں پر بکھر گئی۔ وہ پریشان تھی، بے قرار تھی اور اسی گم شدہ راستے پر بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ اب ماں کی باتیں تھوڑی مختلف تھیں:

''دیکھو نے بابو، اپنی من مانی نے کر دیو (کر دیا) تورا کا حال۔ ای تو وہی ہوگیا کہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ اور ہم دوسرے کو کا کہیں، اس چھوکرے کی اماں کو کا کہیں۔ جب اپنا سکّہ کھوٹا تو پرکھنے والے کو

کا دوش دیں بابو......''

شہزادااوران کی امّاں کا ذکر سن کر سحر پھر نیئے سرے سے مرجھانے لگی۔

بتولن بی اب بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔رات رات بھر کی نیند حرام ہوگئی تھی۔کمزوری بھی بہت بڑھ گئی تھی۔اُٹھتے بیٹھتے کراہنے لگتیں اوراب وہ کسی بھی شریف اور باروزگار لڑکے سے سحر کی شادی کرنے کا دل ہی دل میں ٹھان چکی تھیں۔ میں ان دونوں کی دل جوئی میں لگی رہتی۔کبھی سحر کو ہنسانے کی کوشش کرتی اور کبھی سحر کی امّاں کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا دیتی۔ میں کہتی:

''بتولن بی آپ جو یہ الفاظ منھ سے اَدا کرتی ہیں،لند پھندیا اور دھر پھندیا،توان دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے؟لند پھندیا کون ہوتا ہے بتولن بی اور دھر پھندیا کون؟''

سحر میرے سوال کو سن کر تھوڑا سا ہنسی،جس کی مجھے بے حد خوشی ہوئی۔اور بتولن بی یہ سنتے ہی میری طرف دیکھ کر جواب دینے کو بے چین ہوگئیں۔

''ہائے ہائے،تورے یاد نا رہے ہے۔ارے ہم تو تورے کو بتایا تھا بابو،ارے بتایا تھا نے،کی لند پھندیا اس کو کہا جا ہے جو اِدھر کا بات اُدھر کرے ہے اور اُدھر کا بات اِدھر کرے ہے۔اور دھر پھندیا ئُنی اوکو(اس کو) کہا جا ہے جو کوئی نہ کوئی طرح سے دھور پھانک کے بھی،کہیں نہ کہیں سے بھی،تورا(تمہارا) کام ضرور کردے گا۔اجی جیسے بازار میں نکڑ پر والا شیام درزی ہے،او بڑا دھر پھندیا ہے۔صبح میں شلوکہ اوکو سیئے کو دیا تو شام میں کوئی نہ کوئی طرح سے جرور(ضرور) سی کے دے دے گا۔اورکا،یہی معنی ہے۔''

ویسے بتولن بی کو ان دنوں ہنسانا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ان کی آہیں بھرتی ہوئی شکل دیکھ کر مجھے ان کا باتیں کرتا ہوا پُر جوش چہرہ پھر سے یاد آنے لگا۔امّی اپنی دوسری خادماؤں کو یہ ہدایت دیتی تھیں کہ بتولن بی جب بھی آئیں تو وقت وقت سے ان کے سامنے چائے ناشتہ یا کھانا لاکر پیش کیا جائے۔اسی لیے دوسری

کام کرنے والیوں کا یہ معمول تھا کہ جیسے ہی بتولن بی آتیں، ان کے آگے چائے، ناشتہ یا کھانا ضرور رکھا جاتا۔ ایک دن بہت ہانپتی کانپتی گھر کے اندر داخل ہوتی نظر آئیں تو سب لوگوں نے یکلخت سوال کیا۔

''کیا ہوا بتولن بی، کیا ہوا۔ ارے بھائی آپ ٹھیک تو ہیں نا، ہائے بہت دیر آج کیسے ہوگئی؟''

بتولن بی بولیں، شبھوا کی جورو (بیگم) روز کہتی رہے کی کا خالہ میرے گھر نا آؤ گی، تو اوہی (اسی) کے گھر چلے گئے تھے جی۔''

کسی نے پوچھ لیا، ''کا ناشتہ وہیں سے کر کے آئی ہو کا؟''

تو بتولن بی فوراً بگڑ کر بولنے لگتیں، ''نستے سے کا وستہ (ناشتے سے کیا واسطہ)، چائے ملی او بھی پھیکی تھوک۔''

پھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور دیر تک لوگ دہراتے رہے۔ نستے سے کا وستہ، چائے ملی او بھی پھیکی تھوک۔ اور وہ آج تک ہم لوگوں میں ایک محاورے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بتولن بی کو دیکھ کر میں سوچنے لگی کہ جب سے سحر اور شہزاد کی کہانی شروع ہوئی ہے انہوں نے جیسے مسکرانا ہی چھوڑ دیا ہے اور ایسی مضمحل رہتی ہیں کہ ایک مدّت سے کوئی کہانی، کوئی واقعہ ہم لوگوں کو نہیں سنایا ہے۔ میں پھر سے ان کی پرانی باتوں کو یاد کرنے لگی۔

ایک دن بتولن بی ذرا مسکراتی ہوئی، ہم لوگوں کے آنگن کو پار کر کے دالان کی طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔ سبھوں نے بڑی ہی پُر اشتیاق نظروں سے ان کو دیکھا اور پھر لوگ منتظر رہے کہ آج خدا جانے یہ کون سی کہانی لے کر آئی ہیں اور یہ زیرِ لب کیوں مسکرا رہی ہیں؟ خود ہی پھر مسکرا مسکرا کر بولنے لگتیں۔

''ارے کل شادی میں گئے تھے جی، ایسا بٹیا (دلہن) ہم تو بابو پہلے کبھی نا دیکھا تھا۔''

''کیا ہوا بتولن بی، بتائیں نا، بتائیں نا۔''

''ارے بھائی، مولانا صاحب نکاح پڑھوانے کو آئے بے چارے!''

''ہائے بتولن بی ان کو بے چارے کیوں کہہ رہی ہیں؟''

''ارے بھائی ابھی سنتی نہ جاؤ۔ بٹیا (دلہن) کا تھیں، چیرو چار...... بگھارو پانچ۔ مولانا صاحب اِجاجت (اجازت) لیوے کو آئے تو ابھی او (وہ) پورا جملہ کہے بھی نہیں کی بٹیا بولیں...... جی ہاں، یہ نکاح ہم کو منظور ہے۔''

بتولن بی اس پورے جملے کے ہر لفظ کو زور دے دے کر بولیں۔

''ای جو بٹیا کے منہ سے سنا بابو تو ہم تو ایک دم دنگ رہ گئے۔ نا بابو، آج کل آنکھ کا پانی ہی گر گیا ہے۔ ایسی پٹاخہ بٹیا تو ہم آج تک نا دیکھا تھا۔ اور ہاں، اوہی بٹیا کا دوسرا قصّہ سنو۔ جیسے ہی نکاح ختم ہوا، کہاں کا رونا اور کہاں کا دھونا۔ ایسے ہی مڑ مڑ کے سب کو تاکے لگیں۔ پھر بہن رکابی بھر کھانا دلہن کے لیے لے آئی۔ ہواں (وہاں) دروازے سے دلہا شربت پیئے کو اندر آ رہا ہے اور ہیاں (یہاں) دلہن بیٹھی پورا کھانا ڈھکار لے لے کے کھا گئی۔ اجی کھائی۔ ہاں میرے آنکھ کے سامنے کھا گئی۔''

اور پھر خوب ہنس ہنس کر جھومنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد پھر بولیں۔

''ہائے اللہ کیسی بٹیا تھی۔ جب سب کھانا کھا گئیں تو بہن کو پھر پکارنے لگیں...... ارے اے حسینہ، ذرا ہڈی والا مسالہ دار گوشت اور لا۔ بہن ہڈی والا گوشت اور کھانا لے کر آئی تو پھر ہڈی چبا چبا کر کھائے لگیں۔ ہائے ہم کا بتاویں بنّی، میرا تو دیدہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ ایسا کہیں سنیو ہو (سنی ہو)، کی بٹیا اپنے بیاہ کے روز اتنا پیٹ بھر کے کھانا کھا ہے۔ ایک تو ہم لوگ کا دن تھا، کی مہینہ بھر سے لاج اور شرم میں ڈُوبے رہتے تھے، کہاں کا کھانا اور کہاں کا پینا۔ ہائے ہائے، کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ ارے ابھی کا جانے، اور کا کا دیکھیں گے۔''

میں بتولن بی کی یہ سب سنائی ہوئی باتوں کو یاد کر کر کے ہنس رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نہ جانے وہ کب ویسی ہی بتولن بی ہو جائیں گی جیسی یہ پہلے تھیں۔ میری آنکھیں اسی جیتی جاگتی اور زندہ دل بتولن بی کو ڈھونڈ رہی تھیں جن کے ایک جملے پر ہم بھی بے تحاشہ ہنستے تھے اور گھر میں زندگی کی لہر دوڑا کرتی تھی۔

سحراب اپنی ماں کے اَدا کیے ہوئے ہر جملے کو غور سے سنتی تھی۔ اسے یہ فکر ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی بے عزتی سہہ کر ماں کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ماں اب اس سے کیا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی ماں کے سکون اور خوشی کی خاطر کوئی بھی قربانی دینے کو تیار تھی۔

ماں کہتیں، ''وہی کرو بابو جو تم کو ساجے۔ دیکھو نا بابو، توں (تم) جو ببول کا پیڑ لادوگی تو تو کو (تم کو) اوہی کانٹا ہی نہ ملے گا، آم کہاں سے کھاؤ گی بٹیا!''

پہلے اپنی ماں کی باتوں کو ہمیشہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔

''ارے ای اماں تو بس بولتی ہی رہتی ہیں۔ ان کا اور کام کا ہے۔''

لیکن اب حالات کچھ سے کچھ ہو چکے تھے۔ اسے پھر سے ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''دیکھو بیٹی، چار حرف کا جان لیو (لیا)، ہو تو اوکا (اس کا) شان مت دکھاؤ۔ زیادہ اُڑ مت۔ اوچھا گھڑا چھلکے ہے بابو، دیکھو بھرا گھڑا تو چپ ہی رہے ہے۔''

سحر سوچنے لگی...... میں نے اپنی ماں کے بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچا۔ کیا میری عقل چرنے گئی تھی۔ کہاں وہ لوگ اور کہاں ایک بوسیدہ اور اندھیرے گھر میں رہنے والی میں اور میری ماں۔ ان کی کسی بھی بات کو میں نے نہیں سنا اور بس ہوا میں اُڑتی رہی۔ اور پھر ایسی اُڑان بھری کہ قدموں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی۔

سحر بار بار اپنی بے عقلی اور جذباتی پن کو ملامت کرتی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ عشق اندھا ہوتا ہے۔

وہ بھی تو عشقِ بلا خیز میں اندھی ہوگئی تھی کہ حویلی اور جھونپڑی کے نمایاں فرق کو نہ دیکھ سکی اور ماتھے پر رُسوائی کا لیبل لگا بیٹھی۔ اپنی ماں کی اُجڑی شکل دیکھ کر اس کا کلیجہ کٹتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے دریچے کو بند کر دیا۔ جس دریچے نے اس پر بے عزتی کے دروازے کھولے ہیں، وہ اب اسے کبھی نہ کھولے گی۔ ہر وہ راہ جو شہزاد تک جاتی ہے، اس راہ پر وہ قدم نہ رکھے گی۔ راستے میں کبھی وہ نظر بھی آجائے گا تو اس کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔

شہزاد اب بہت فکرمند رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر ہم لوگوں کے گھر پر اس امید میں فون لگاتا کہ شاید کبھی سحر فون اُٹھا لے اور اس سے چند لمحوں کی بھی بات ہو جائے، لیکن زیادہ تر دوسرے ہی لوگ فون اُٹھاتے تھے۔ سحر پر اب بتولن بی کی بہت کڑی نظر رہنے لگی تھی۔ اتفاق سے ایک دن جب شہزاد نے فون کیا تو سحر نے ہی فون اُٹھا لیا۔ شروع میں سحر نے ہلو کہا تھا جس سے شہزاد کو پتہ چل گیا تھا کہ دوسری طرف سحر ہی ہے، لیکن اُدھر سے جب شہزاد کی آواز آئی تو وہ خاموش ہوگئی۔ شہزاد ہلو ہلو کرتا رہا اور بولتا بھی رہا لیکن سحر بالکل خاموش، گم صم سی رہی۔ صرف تیز سانسوں کا ایک سلسلہ تھا جسے شہزاد بخوبی محسوس کر رہا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر اپنے دل کی بات سحر کے کانوں میں ڈالتا رہا۔

''سحر میں صرف تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔ میں تمہارے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ امّی اور ابو کو اگر جان دینی ہے تو دے ڈالیں، میں کسی کی ایک بھی نہیں سنوں گا۔ ہم لوگ اپنی ایک نئی دُنیا بسائیں گے۔ تم تو تیار ہونا، تم میرا ساتھ دوگی نا سحر؟ میں اگلے جمعہ کو تمہیں لینے آؤں گا، ہم اور تم کہیں دُور، بہت دُور چلے جائیں گے جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو، نہ پہچانتا ہو۔''

یہ سب سن کر سحر تقریباً کانپنے لگی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بولے۔ شہزاد یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟ اب میں اگر اس کے ساتھ بھاگ گئی تو میری ماں کو لوگ کیا کیا نہ کہہ ڈالیں گے کہ ان کی بیٹی

کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ پھر دوسرے ہی پل وہ شہزاد کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ دُنیا والے ہم لوگوں کو ملنے نہیں دیں گے اور ہمیشہ کے لیے ہم بچھڑ جائیں گے۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے آخر کار فون رکھنے سے قبل صرف اتنا کہا کہ ''ٹھیک ہے، میں اگلے جمعہ کو تیار رہوں گی، تمہارا انتظار کروں گی شہزاد۔''

شہزاد خوشی سے پاگل ہونے لگا اور سحر سے بولا، "I Love you Sehar, I Love You"

سحر نے فون رکھ دیا۔ اس کے پورے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کی پلکیں بوجھل سی ہو گئیں اور کاجل سے لبریز آنکھیں خمار آلود ہو گئیں۔ اس کا ذہن جیسے ہواؤں میں اُڑنے لگا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے کافور ہو گئی۔

سحر کی خالہ نے اپنی بہن سے کسی لڑکے کا ذکر کیا تھا جو لکھنؤ میں رہتا تھا اور اسے کسی شریف گھرانے کی لڑکی کی تلاش تھی۔ شروع میں بتولن نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ سحر کی پسند و ناپسند کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں لیکن اب حالات بدل چکے تھے، بتولن بی اپنی بدنامی اور رُسوائی سے اس قدر بے چین ہو گئیں کہ اب وہ کسی بھی شریف انسان کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے کے لیے بالکل تیار تھیں۔ انہوں نے اپنی بہن سے اس لڑکے کے بارے میں ساری تفصیلات حاصل کیں اور امّی سے مشورہ کرنے کے لیے ہم لوگوں کے گھر آ گئیں۔

لڑکے کا نام عبدالرحمٰن تھا جن کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ والدہ کا بھری جوانی میں انتقال ہو گیا تھا اور کچھ ہی دنوں کے بعد والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ خالہ خالو کی آغوشِ عاطفت میں پروان چڑھے اور انہوں نے عبدالرحمٰن کو بہتر تعلیم و تربیت دی۔ وہ دُنیاوی اور دینی تعلیم اور اس کے مقاصد کو حاصل کرنے میں ہمیشہ مشغول رہے۔ انہیں بچپن سے ہی علم و ادب سے کچھ اس طرح کا لگاؤ تھا کہ ان کے شب و روز علمی اور ادبی دلچسپیوں میں ہی گزرتے رہے۔ خاندان میں ہر طرف ان کے علم و ہنر کا تذکرہ رہتا۔ عبدالرحمٰن سراپا ہندوستانی تہذیب اور قدیم روایات کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ سفید چکن کا کام کیا ہوا کُرتا، سفید پاجامہ اور دو پلّے والی ٹوپی پہن کر صبح صبح گھر سے نکلتے۔ سلیم شاہی جوتا

پہننے کا انہیں بہت شوق تھا جس کی نوک آگے سے نکلی ہوتی ہے۔ اس پر کلابتوں کا سنہرا کام کیا ہوا ہوتا اور ساتھ میں جرابیں بھی ضرور پہنتے۔

عبدالرحمٰن دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھے۔ کھڑا ناک نقشہ، گندمی رنگت، شاعرانہ مونچھیں اور بہت ہی مختصرسی داڑھی۔ بڑا ہی پُرسکون چہرہ تھا۔ ان میں خاکساری، صبروتحمل جیسی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ مذہب سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز مسجد میں اَدا کرتے۔ ماں باپ نے اتنی دولت چھوڑی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی۔ ان کی اپنی کتابوں کی دکان شہر میں تھی۔ وہ روز صبح میں تیار ہوکر جاتے تھے اور کچھ دیر دکان کی دیکھ بھال کر کے اور مطالعے کے لیے ایک دو کتابیں لے کر گھر واپس آجاتے، چونکہ دکان میں کئی بااعتماد ملازم تھے، باقی تمام دن ملازمین ہی ان کی دکان کو سنبھالتے اور ان کا وقت شعروشاعری اور ادبی مطالعے میں گزرتا۔ ان کے والد بھی بہت ہی شریف انسان تھے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور مصنف بھی تھے۔ اپنی زندگی میں وہ اپنا دیوان نہ چھپوا سکے جس کی فکر عبدالرحمٰن کو ہر پل ستاتی تھی۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے اپنے والد کا ضخیم دیوان طبع کرایا اور اپنے فرض کی ادائیگی کے بعد قلبی سکون حاصل کیا۔ عبدالرحمٰن خود بھی شعر کہتے تھے اور استاد شاعروں کے منتخب اشعار ازبر رکھتے تھے۔ اپنے والد کی شاعری سے عقیدت رکھتے تھے اور اکثر مشاعروں اور محفلوں میں اپنے والد کے اشعار سنانے سے آغاز کرتے، پھر اپنا کلام سناتے۔ عبدالرحمٰن ایک ایسے تخلیق کار تھے جو الفاظ کو اپنے اشعار میں نگینے کی طرح سجا دیتے تھے۔ ان کی شاعری میں کچھ ایسی تہہ داری ہوتی تھی کہ صاحبِ ذوق سامعین کے آگے مشاعرہ لُوٹ کر ہی اُٹھتے۔ الفاظ کو بہت ناپ تول کر استعمال کرتے تھے۔ تخلیقی جوہر ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مشاعروں میں وہ ترنم سے اپنے اشعار جھوم جھوم کر سناتے تھے۔ گویا مذہبی، اخلاقی، علمی اور ادبی خوبیوں سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی اعتبار سے بھی وہ ایک مستحکم حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں

اگر کوئی کمی تھی تو بس یہ کہ وہ سحر سے عمر میں تقریباً پندرہ سال بڑے تھے۔

عبدالرحمٰن کے بارے میں پوری تفصیل بتولن بی نے امّی کو بتائیں۔امّی کہنے لگیں۔

''سب کچھ ٹھیک ہے بتولن بی لیکن لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔سحر سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ یہ ساری بات آپ سحر کو ضرور بتا دیجئے اور اس کی رائے بھی ضرور لیجئے۔''

امّی کی یہ بات سنتے ہی بتولن بی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں لیکن پھر کہنے لگیں۔

''ایک بات سنیے صاحب۔آپ ہی بتایئے کا (کیا) میرے ماں باپ نے ہم سے پوچھا تھا کی بتاؤ بیٹی تمرا شادی کہاں کریں۔نہیں نا؟ ہائے تو کا ہم بُرے رہے۔بہت اچھے سے رہے''۔پھر یک بیک رونے لگیں، ''ارے صاحب، او پلے کا بچہ اگر میرے سرکار کے پیچھے نا پڑتا تو ابھی ہم لوگ بہت اچھے رہتے۔میرے کوئی کمی نہیں تھی۔ہم تو صاحب راج کرتے تھے۔''

پھر آہستہ آہستہ اپنے آنچل سے آنسو خشک کرنے لگیں اور پھر دھیمے سے بولیں۔

''اور اس چھوکری سے ہم پوچھیں گے تو کا آپ کا سمجھتی ہیں، کی اوُ'ہاں' کہے گی؟ کبھی نا کہے گی۔نہیں صاحب، او (وہ) ہم کو بہت بڑے جنجال میں پھنسا چکی ہے۔اب ہم اوہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔''

امّی نے سوال کیا ''تو کیا آپ سحر کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دیجئے گا؟''

جواب میں بتولن بی زور زور سے کہنے لگیں، ''ہاں ہاں کر دیں گے۔صاحب، ہم تو آپ سے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں صلاح مشورے لیتے رہے، مگر نا صاحب، ای بات کا پھیسلہ (فیصلہ) تو ہم ہی کریں گے۔آپ رہنے دیجئے۔شکریہ صاحب۔''

شکریہ بولتے بولتے اپنے کمزور ہاتھوں کو پیچھے کی طرف پھینکتے ہوئے باہر کی طرف جانے لگیں۔ اور امّی بھی چپ چاپ دالان کے تخت پر بیٹھی ان کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔

سحراب بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔ وہ اب اپنی ماں کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ آج سحر میرے کمرے میں آئی اور خاموشی سے میرے بستر کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموشی سے مجھے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا سحر، تم ٹھیک ہونا؟''

وہ بولی، ''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

میں جانتی تھی کہ سحر ٹھیک نہیں ہے۔

''تو پھر کیا بات ہے، اتنی تھکی ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟''

میرے اس سوال کا جواب وہ نہیں دے سکی۔ بس میرے گلے میں بانہیں ڈال کر زاروقطار رونے لگی۔ میں نے بھی اس کو رونے دیا۔ پھر اس سے کہا ''تمہیں جو کہنا ہے سحر کہہ ڈالو۔ ہلکا کر لو اپنا دل۔''

تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھ سے التجا کی کہ جمعہ سے پہلے اسے ایک بار شہزاد سے ملنا ہے۔ مجھے یہ کام بے حد پُر خطر لگا۔ سحر نے میرے ذمّے یہ کام دے کر مجھے بڑی ہی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اگر کسی نے کچھ دیکھ لیا یا سن لیا تو پھر قیامت ہی آجائے گی۔ بتولن بی تو یوں بھی پریشان رہ رہی تھیں۔ اگر انہیں ذرا بھی بھنک مل گئی تو خدا جانے ان کا کیا حشر ہوگا۔ شاید ہمیشہ کے لیے مجھ سے ناراض ہو جاتیں۔ شاید وہ زندگی میں کبھی بھی میری شکل جیتے جی نہیں دیکھتیں جو کہ بالکل واجب تھا۔''

لیکن سحر کی بے قراری کو دیکھ کر میں اس سے انکار نہیں کر سکی اور اس سے وعدہ کر لیا کہ میں کسی نہ کسی طرح شہزاد کو اس کے لیے ضرور بلواؤں گی۔ میں نے کئی بار شہزاد کے گھر پر فون لگایا لیکن ہر بار اس کے ابّا یا امّاں ہی فون ریسیو کرتے تھے۔ آخر کار ایک بار شہزاد نے ہلو کی تو میں نے اس سے کہا کہ سحر اس سے آج ملنا چاہتی ہے۔ فون ہی پر شہزاد کی آواز سن کر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خوشی کے مارے دیوانہ ہو رہا ہے۔

اس نے کہا کہ سورج کے غروب ہوتے ہی ہم لوگوں کے گیٹ کے قریب جو یوکلپٹس کا پیڑ ہے، اس کے قریب والی جھاڑی کے پاس وہ سحر کا انتظار کرے گا۔ میں نے شہزاد سے یہ ساری باتیں سن لیں اور سحر کو جا کر بتا دیا کہ آج شہزاد کس جگہ پر اس کا انتظار کرے گا۔ دن بھر مجھے ایک بے چینی سی رہی کہ اللہ جانے آج کیا ہوگا۔ شہزاد کے کان میں یہ بھنک تو مل ہی گئی تھی کہ سحر کی اماں اس کی شادی کہیں طے کر رہی ہیں۔ اس لیے وہ بے حد پریشان تھا اور اسے بھی سحر سے ملنا بہت ضروری تھا، لیکن میں بے حد گھبرا رہی تھی۔ ایک عالم ان دونوں کے خلاف ہے اور اگر کسی کو بھی اس بات کا علم ہو گیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں تو ایک حشر برپا ہو جائے گا، لیکن ان دونوں کی بے قراری اور سحر کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر میں یہ دُشوار اور پُر خطر قدم اُٹھانے کی ہمت بٹور رہی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔

کٹاری ٹولہ مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی یعنی شام کے ڈھلتے ہی ہر کوئی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مسجد کی جانب روانہ ہونے لگتا۔ شہزاد بھی ٹھیک اسی وقت، جیسے کسی عبادت کو پیش نظر رکھ کر ہم لوگوں کے بڑے گیٹ کے پاس ایستادہ یوکلپٹس سے متصل جھاڑیوں کے قریب آنے کے لیے اپنے گھر کے دالان سے اُٹھا۔ اُترتی شام کا چہرہ بھی مٹیالا ہو چکا تھا اور رات نے اپنا آنچل پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ آسمان پر ستاروں کے دیے بھی ٹمٹمانے لگے۔ سڑک کے بجلی کے کھمبے کی بس ہلکی سی روشنی میں چند سائے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ جیسے ہر سائے کو کسی نہ کسی چیز کی تلاش ہو۔

وہ آہستہ آہستہ اسی مدھم سی روشنی میں بڑھتی ہوئی تھکن کو اپنے کاندھے پر اُٹھائے اُٹھائے اپنی آخری اُمید کی طرف بڑھ رہی تھی جو کہ اس کی منزل تھی اور منزل تلاش کرنے میں سوا تھکن کے اور کیا ملتا ہے! کچھ بھی تو نہیں۔ وہ سوچتا جا رہا تھا......

''سحر، میں اپنی بے خواب راتوں میں تمہارے ہی خلوص، مہر ومحبت کی موجوں میں بہتا رہتا ہوں۔اسی ندی کے ساحل پہ میری نگاہیں جمی رہتی ہیں جہاں پر تم اپنا کندن سا چہرہ لیے کھڑی ہو۔وہی میری منزل ہے۔بس مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے، کچھ بھی نہیں۔تمہارے چہرے کا سورج میری زندگی میں طلوع ہو جائے تو میرے دن رات روشن ہو جائیں۔تمہارے شانوں کا سہارا مل جائے تو میں زندگی کا کڑا سفر ہنستے ہنستے طے کرلوں۔تمہاری آنکھوں کے چراغ میری تاریک رہ گزر کو منور کر دیں تو میں ہر مشکل کو پار کرلوں۔سحر! تم تو میری سانسوں کا سبب ہو، دل کے دھڑکنے کی وجہ ہو، میری زندگی کا حاصل ہو!''

جب وہ بڑے گیٹ کے کے قریب پہنچا تو اسے یوکلپٹس کا درخت تو نظر آیا لیکن اسے تو وہ جگہ تلاش کرنی تھی جہاں اسے سحر سے ملنا تھا۔آخر کار وہ ان جھاڑیوں کے قریب پہنچ گیا اور زمین پر گرے ہوئے ایک سوکھے ہوئے درخت کے چوڑے چھلکے تنے پر بیٹھ کر سحر کا بے قراری سے انتظار کرنے لگا۔وہ سوچنے لگا کہ نہ جانے آج سحر اس سے کس انداز سے ملے گی۔شاید وہ آج میری ہو جائے یا مجھے مکمل طور پر ٹھکرا ہی دے۔چلو اگر وہ کچھ بھی نہ دے پائے گی تو کم از کم چند میٹھے الفاظ کے زخم تو دان میں دے ہی دے گی۔اس آخری ملاقات کے سہارے وہ زندگی کا پورا سفر تنہا گزار لے گا، لیکن سحر کے علاوہ کسی اور کو وہ اپنا ہم سفر نہیں بنائے گا۔وہ سحر کے علاوہ کسی اور کو تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔یہ اس کا اٹل فیصلہ تھا جو کہ اس نے اپنے ماں باپ سے بھی کہہ دیا تھا۔وہ لوگ بھی اس کے فیصلے کو سن کر خاموش رہے اور یہی سوچتے رہے کہ سحر سے شادی کرنے سے تو یہی بہتر رہے گا کہ شہزاد ساری زندگی شادی ہی نہ کرے۔

اس کی چھٹی حس بھی یہی خبر دے رہی تھی کہ جیسے سحر کو اپنا بنانے کا ارادہ اسے راس نہیں آئے گا اور ایسے خیالات سے بھی وہ کانپ رہا تھا۔اس کے جسم میں ایک کپکپی سی ہونے لگی اور وہ بے چینی سے اپنے سر کو جھٹکنے لگا۔

پھر اسے اپنی پاک صاف محبت اس پتھر جیسے شہر میں چکنا چور ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُمڈ کر آتے رہے۔ گہرے دُکھ، حسرت اور ایسی مجبوریوں کے باوجود بھی اس کا دل پوری طرح سے نا اُمید نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسرے ہی پل یہ بھی سوچنے لگتا کہ شاید سحر کے قدموں کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی کوئی روشنی کی کرن بھی اسے دِکھائی دینے لگے۔ وہ ان روشن ستاروں کی چاپ کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سحر کے انتظار میں وہ وہاں پر کافی دیر تک بیٹھا رہا۔

اچانک ایک آہٹ ہوئی۔ شہزاد نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سحر ہانپتی کانپتی، ٹھوکریں کھاتی، پیڑ پودوں میں راستہ بناتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی۔ سحر کا تمتمایا ہوا چہرہ مدھم سی روشنی میں بھی کندن کی طرح چمک رہا تھا، لیکن اسے دیکھ کر شہزاد اور اُداس ہو گیا جب اس نے قریب سے سحر کی آنکھوں میں بہت سارے رتجگوں کی سرخیوں کو محسوس کیا۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سحر اپنی بجھی بجھی سی آنکھوں میں اشک لیے شہزاد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ باغ کی ناہموار زمین پر اس کا ستواں جسم بے حال و پریشان کسی سہارے کے لیے لڑکھڑا رہا تھا۔ شہزاد تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ سحر کا سراپا آبِ حیات بن کر شہزاد کے وجود پر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا اور اسے اپنے آپ میں عجیب توانائی محسوس ہونے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو چند لمحوں تک دیکھتے رہے اور پھر بے قرار ہو کر لپٹ گئے۔ سحر زار و قطار رونے لگی۔ اس قدر روئی جیسے زندگی میں کبھی اُسے رونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور آج موقع ملتے ہی پھوٹ پڑی تھی۔ جیسے کوئی باندھ ٹوٹ گیا ہو اور سب کچھ ختم ہو جانے والا ہو۔

''سحر...... سحر!'' شہزاد اسے بیتابی و بے قراری سے پکار رہا تھا جیسے کہ سحر کہیں بہت دُور کھڑی ہو، ''سحر! میرے دل کی دھڑکنوں کو تم بھی میرے ساتھ ساتھ سنو، دیکھو تمہارے لیے میرا دل بھی کس قدر بے چین ہے۔ تم گھبرانا نہیں سحر، اندھیرے کے بعد اُجالا تو آئے گا ہی۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے بہت دُکھ

اُٹھائے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کے لیے ضرور کوئی راستہ نکالے گا۔"

شہزاد کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ سحر اس سے کیا کہنے آئی ہے۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ صرف بے اختیار ہو کر رو پڑی تھی۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی سوائے رونے کے لیکن وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہا تھا کہ آج وہ ضرور کہے گی......

"شہزاد، میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔ بتاؤ تم مجھے لینے کب آ رہے ہو۔ کل آنے کا وعدہ کیا تھا نا...... تو تم کل آ رہے ہو نا؟ چلو ہم تم کہیں دُور کسی جنگل میں گم ہو جائیں۔ وہیں کسی کٹیا میں زندگی کے دن خوشی خوشی گزار ڈالیں۔ دُنیا میں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں بھی اپنی پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ تو پھر ہم اور تم تو اپنی محبت کے سہارے بہت ہی حسین زندگی گزار سکتے ہیں" یا یہ کہے گی کہ "شہزاد میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آج کی ملاقات ہم دونوں کی آخری ملاقات ہے۔"

اُمید و نااُمیدی کی کشاکش کے بیچ وہ سحر کو چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا دل سحر کے آنسوؤں کو دیکھ کر پاش پاش ہو رہا تھا۔

"سحر تم نے دریچے پر آنا کیوں ترک کر دیا؟ اتنے دنوں سے مجھے تمہاری کوئی بھی خبر نہیں ملی۔ میں تمہارے لیے بے چین ہوتا رہا۔ تم کہاں تھیں سحر؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر پریشان ہو۔"

"مجھ پر کیسی کیسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، تمہیں کیا خبر۔ میں کس طرح مسکراتی شہزاد۔ بھلا میں کس طرح چٹانوں کی سختی کو موم بنا دیتی۔ تم تو لفظوں سے اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیتے ہو اور مجھے...... مجھے تو یہ ہنر بھی نہیں آتا کہ میں اپنے دل کی بے قراری کو بیان کر سکوں۔ شہزاد، تمہیں یہ یقین ہے نا کہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں صرف تمہارا عکس چھپا ہوا ہے اور کسی کا بھی نہیں۔"

شہزاد نے کہا "ہاں، مجھے تم پر اور تمہاری محبت پر پورا یقین ہے سحر۔"

''لیکن شہزاد اب میں ٹوٹ چکی ہوں۔ ساری دُنیا کو میری خوشی سے کچھ ایسا بیر ہے کہ میں نڈھال ہو کر رہ گئی ہوں۔ میری رُوح چھلنی چھلنی ہو گئی ہے۔ میں ایک تماشا بن کر رہ گئی ہوں۔ میری پاک محبت بازار کی جنس بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ دل کے جذبوں کی سرخروئی میری رُسوائی کا سبب بن جائے گی۔ میرے دل نے صرف محبت کرنے کا جرم کیا تھا۔ میں اپنی ہستی کو جانتی ہوں۔ اس لیے میں نے کبھی اُونچے محلوں کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ اب یہ تقدیر کا تماشا ہی ہے کہ دل جس پہ آیا، وہ محلوں کا راج کمار نکلا۔''

شہزاد، سحر کی باتیں سن سن کر بے قرار ہو گیا اور کہنے لگا، ''نہیں سحر، میں اپنی محبت کے دربار کا ایک ادنیٰ بھکاری ہوں۔ وہ محل میرے باپ کا ہے۔ میں تو اپنی محبت کی خیرات پر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ایسی باتیں کہہ کہہ کر مجھے اپنی نظروں میں مت گراؤ سحر۔''

''شہزاد، میں تم کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہی ہوں۔ یہ ہم دونوں کا نصیب ہے۔ جرمِ محبت دونوں سے سرزد ہوا ہے۔ اس کی سزا تو دونوں کو ساتھ ساتھ تاعمر بھگتنی ہے۔ شہزاد مجھے تو اب تمہیں یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کس انتہا تک تم کو چاہتی ہوں۔ تمہارے بغیر اپنے آپ کو تصور میں لانا بھی میرے لیے گناہ ہے، لیکن میں کس طرح اپنی بوڑھی ماں کی رُسوائی کا سبب بن کر رہ جاؤں۔ وہ ماں جس نے اپنی لنگڑی ٹانگ سے گلی گلی کی خاک چھان کر مجھے پالا ہے۔ میں جب اپنی ماں کا چہرہ دیکھتی ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آج تک اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اسے میں نے کوئی سکھ نہیں دیا، تو کم از کم اسے اتنی بڑی چوٹ تو نہ دوں، میری ماں بستر سے لگ گئی ہے اور وہ اس رُسوائی کا ذمہ دار مجھ کو ہی ٹھہراتی ہے۔ میں اپنے اندر وہ طاقت ہی نہیں پا رہی ہوں کہ میں خود کو سنبھال لوں، پھر میں کس طرح اپنی غریب بوڑھی ماں کو سنبھالوں۔ تم ہی بتاؤ شہزاد۔ ان کا وجود اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ جس دن سے تمہارے والدین

یہاں گھر میں آ کر خفا ہو کر گئے ہیں اس دن سے وہ بستر سے اُٹھی بھی نہیں ہیں۔ خود میرا حال یہ ہے کہ میرے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ میں یہاں سے اُٹھ کر حویلی کے دروازے تک جاسکوں۔ خدا جانے میں کس طرح یہاں سے اُٹھ کر جاؤں گی۔''

شہزاد کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سحر کے سامنے اپنے ماں باپ کے سلوک کے لیے بہت نادم ہو رہا تھا۔ وہ قصداً خاموش رہا اور اس نے سحر کو بولنے کا پورا موقع دیا۔

''شہزاد! مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنی محبت میں کھری نہیں اُتری۔ یہی سمجھ لو۔ آج مجھے تم سے ملنا بہت ضروری تھا۔ میں خود بھی تم سے یہ ساری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے ارادوں کی تکمیل میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں گھر سے بھاگ کر اپنی ماں کو زندہ درگور نہیں کر سکتی۔ مجھے معاف کر دو شہزاد۔''

شہزاد بے قرار ہو گیا۔ ''سحر، تم یہ کیا کہہ گئی ہو۔ تم یہ کبھی نہیں کر سکتی ہو''۔ وہ دیوانگی کے عالم میں بولے جا رہا تھا، ''میں ساری دُنیا کو تمہارے لیے چھوڑ دوں گا اور تمہاری اماں کو منا لوں گا۔ چلو ابھی چلو۔ میں ان کے پاؤں پکڑ لوں گا اور تمہیں ان سے مانگ لوں گا۔ میں ان سے اپنی جھولی پھیلا کر تمہیں بھیک میں مانگ لوں گا۔ چلو تو سہی، دیکھو تو کہ میں کیسے انہیں مناتا ہوں۔ اُٹھو سحر اُٹھو۔ میں تمہیں اور تمہاری اماں کو لے کر اپنے ماں باپ سے دُور، بہت دُور کہیں چلا جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کو ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں کا وہ کبھی پتہ بھی نہ لگا سکیں گے۔''

سحر، شہزاد کی دیوانگی دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کے دل پہ تو خود ہی ایک قیامت گزر رہی تھی، لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ شہزاد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، مگر جو حالات سامنے آئے، انہوں نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اسے تو شہزاد کی محبت پر پورا یقین تھا لیکن وہ کیا کرتی۔

''مجھے پتہ ہے شہزاد، تم نے میری غربت، میری مجبوریوں کے ساتھ مجھے پسند کیا تھا، مجھے اپنا بنایا تھا۔ تمہارا دل تو بالکل شیشے کی طرح صاف وشفاف ہے۔ اس میں کسی بھی طرح کا بھید بھاؤ نہیں ہے۔ اب تو واقعی مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کس طرح اپنی ہی محبت کے قتل کا داغ دھوؤں گی۔ میں کس طرح تمہارے بغیر زندگی بسر کروں گی۔ میرے جینے کا مقصد تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف سانس لینے کو اگر جینا کہا جاتا ہے تو اب یہی میری زندگی ہے اور اسی طرح سے مجھے جینا ہے۔ میری ماں تمہیں کسی بھی صورت میں قبول نہیں کر پائے گی۔ یہ مجھے یقین ہے، چاہے تم جو بھی کرلو۔ وہ اپنے اوپر لگے الزام کو اور پختہ نہیں کرنا چاہے گی اور نہ ہی کسی سے اس کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے جدا کرنے کا گناہ کرے گی۔ وہ غریب ہیں، لیکن خودغرض نہیں۔ شہزاد مجھے معاف کردو۔''

یہ کہتے ہوئے وہ شہزاد کے بہت قریب چلی گئی اور اسے نزدیک سے دیکھا جو کہ شاخوں کے کچھ زردی مائل پتوں کے بیچوں بیچ بالکل سکتے کے عالم میں اپنا زرد چہرہ لیے کھڑا تھا۔ اس نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ ''شہزاد، مجھے معاف کردینا۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے دیکھے بغیر اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف آہستہ آہستہ جانے لگی اور بولتی رہی۔

''مجھے معاف کردو...... مجھے معاف کردو۔''

اور یک بیک وہاں سے دوڑ کر ہم لوگوں کے گھر کی طرف آنے لگی تھی کہ اس کا نیلا دوپٹہ وہیں کسی جھاڑی سے اٹک گیا۔ شہزاد، سحر کی طرف شکستہ قدموں سے بڑھنے لگا اور بے اختیار ہوکر پکارنے لگا۔

''سحر!......سحر!......''

لیکن سحر نے اپنے دوپٹے کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچا۔ دوپٹہ جھاڑیوں میں پھنس کر پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا وہیں خاردار جھاڑی میں اٹک کر رہ گیا اور وہ چھوٹے چھوٹے پودوں کو پھلانگتی ہوئی، زاروزار روتی ہوئی

گھر کے اندر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ شہزاد دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ شہزاد کے ہاتھوں میں سحر کے دوپٹے کا ایک ٹکڑا، جو کہ اس وقت اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا، رہ گیا۔

وہ دیر تک حسرت سے دوپٹے کے اس ٹکڑے کو گھورتا رہا۔ پھر وہ زمین پر گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کے جسم کی ساری طاقت جیسے ختم ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا......

''آخر میں یہاں سے اُٹھ کر کیسے جاؤں اور جاؤں بھی تو کہاں جاؤں؟ میں تو پہچان کے سارے چہرے بھول چکا ہوں۔ میں کسی کو کیا کہوں گا۔ اب میرے جینے کا مقصد کیا رہے گا۔ میں اپنے دوستوں کو کیا بتاؤں گا کہ سحر نے مجھے آج ٹھکرا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چلی گئی۔ مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ زندگی کے کڑے سفر میں آبلہ پائی ہی میرا نصیب بن گئی ہے۔ کیا میں اپنے ماں باپ کو یہ خوش خبری سنا دوں کہ وہ جو میری سانسوں میں دل بن کر دھڑکتی تھی اور ان کی نگاہ میں کانٹا بن کر کھٹکتی تھی، اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُور جا چکی ہے۔ وہ اب جشن منائیں اور میں اپنی رُوح کی موت کا ماتم مناؤں......''

میں اپنے کمرے میں بے قراری سے سحر کا انتظار کر رہی تھی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کبھی میں کھڑکی کے قریب جا کر گہرے اندھیرے میں باہر کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگتی اور کبھی اپنے کمرے کے دروازے پر کسی کے ہاتھوں کی جنبش کو محسوس کرنے کے لیے بے چین ہو جاتی۔ سحر کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں سوچتی جاتی...... یا اللہ! آخر وہاں کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں کی باتیں آخر کب ختم ہوں گی؟

جب میں باہر کی طرف دیکھتی تو میری کھڑکی سے یوکلپٹس کا پیڑ تند ہوا کے جھونکوں میں بے قرار تیرگی میں بھی نظر آ رہا تھا، لیکن اس کے علاوہ نہ کوئی سایہ، نہ کوئی جنبش۔ میں دل ہی دل میں سحر پر ناراض

ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا اندیشہ ہونے لگا کہ یہ دونوں کہیں فرار ہو گئے ہیں۔ ہائے تو میں کیا کروں گی؟ کسی کو کیا بتاؤں گی؟ اللہ، سحر یہ تو تمہاری خود غرضی ہے۔ اگر میں پکڑی گئی تو کہیں کی بھی نہیں رہوں گی۔ مجھے امّی تو ڈانٹ پلائیں گی ہی اور بتولن بی نہ جانے اپنے مخصوص انداز میں کیا کچھ نہیں کہہ جائیں گیاور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جائیں گی۔

جس پل میں سحر کی واپسی سے نا اُمید ہو چکی تھی، ٹھیک اسی وقت سحر بے جان سی میرے کمرے میں بہت آہستہ سے داخل ہوئی اور اس نے کمرے کے اندر آکر دروازے کو دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اسی طرح سے بند کر دیا جس طرح وہ اپنے خوابوں کے دریچوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے آئی تھی۔ اسے مجھ سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں نے اس کی آنکھوں کی ویرانی سے ساری باتیں خود بخود سمجھ لی تھیں۔ مجھے پتہ تھا کہ شہزاد نے کیا کہا ہوگا اور سحر پھر اس سے کیا کہہ کے آئی ہے۔ میرے کمرے کے دروازے کو بند کر کے پہلے اپنی پشت دروازے سے لگا کر کھڑی رہی۔ پھر ایسا لگا کہ وہ اب کھڑی نہیں رہ سکتی ہے، تو آہستہ آہستہ اپنی پیٹھ کو سرکاتی ہوئی نڈھال سی زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دو منٹ کے لیے کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

میں بھی اس کے ساتھ ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی سے اُلجھے ہوئے بالوں کو ہٹایا اور پھر اسے ایک ناکام سا دلاسہ دینے کی کوشش کی، لیکن اب سحر کے اندر رونے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ وہ بس خاموش تھی اور شاید کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔

میں نے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو مجھے ایسا لگا کہ اس کی دھڑکنوں کی شہنائی تڑپتے ہوئے دل کے بَین میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے دلاسہ دینے سے بھی کیا ہوتا۔ دلاستہ اتنی بڑی مصیبت میں کب کام آتا ہے۔ میں اس سے پوچھتی کیا، یا کہتی کیا، سوائے اس کے کہ......

''سحر، تم کو اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ اگر تم نے خود کو نہیں سنبھالا، پھر تمہاری ماں کا کیا ہوگا۔ وہ تم کو اس قدر پریشان دیکھ کر شاید برداشت نہ کر پائیں۔''

سحر نے اس بات کی تائید میں اپنا سر ہلایا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گی، وہ ہر حال میں مسکرانے کی کوشش کرے گی۔ وہ اپنی ماں پر یہی ظاہر کرے گی کہ اگر اسے شہزاد نہ مل سکا تو اسے کوئی فکر نہیں ہے۔ اسے یہ احساس پہلے تو نہیں تھا، لیکن اب وہ ہر وقت یہی سوچ رہی تھی کہ......

''آخر میں نے کیوں چاند کو پانے کی تمنا اپنے دل میں جگائی۔ کیا مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں ایک غریب ماں باپ کی غریب لڑکی ہوں جس نے ایک بوسیدہ مکان میں زندگی بسر کی ہے۔ کیا مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ شہزاد کی عالیشان کوٹھی تو لوگوں کو دُور سے ہی نظر آتی ہے اور اس عالیشان عمارت کے نیچے ایک بھربھری دیواروں والے چھوٹے سے مکان میں جو ایک معمولی سی ٹھوکر سے بھی گر سکتا ہے، وہاں میں رہتی ہوں۔ کیوں میں نے اپنے آپ سے ایسی دُشمنی کی۔ میں نے خود ہی کو دھوکا دیا۔ یہ رُسوائیاں، اُداسی اور بے قراری کی ذمہ دار میں خود ہی ہوں، اور کوئی نہیں۔ شہزاد نے تو مجھ سے بے لوث محبت کی تھی۔ اُونچ نیچ کے فرق کے بغیر مجھ کو چاہا تھا، لیکن اس کے ماں باپ نے تو میری چاہت نہیں کی تھی کہ انہیں آسمان زمین کا یہ فرق نظر نہیں آتا۔ ان کا بھی کیا قصور ہے؟ آج تک مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی لگا ہے؟ پیر کی جوتی میں ہیرے جواہرات جڑے ہوں تو بھی اسے پیروں ہی میں پہنا جاتا ہے، سر کا تاج نہیں بنایا جاتا۔ ساری سچائیوں کو جانتے بوجھتے میں نے خود کو ذلت کے غار میں گرا لیا، اب دل کی بربادی کا تماشا دیکھنا ہے اور بس!''

سحر کا وجود اندر سے بُری طرح شکستہ ہو چکا تھا۔ اسے خود کو سنبھالنے میں زمانے لگنے والے تھے۔ اس کے چہرے پر اتنی ویرانی تھی کہ دیکھ کر دل کانپ اُٹھتا۔ ادھر بتولن بی چپکے چپکے اس کے رشتے کے لیے اپنی بہن سے برابر تقاضا کر رہی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ بتولن بی سے کہہ دوں کہ سحر کو سنبھلنے کے لیے

تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ ابھی تو اس کے لبوں پر آہیں ہیں اور وہ زبردستی مسکراہٹ سجانا چاہتی ہیں۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے وجود پر شہانہ جوڑا چڑھانے کے درپے ہیں۔ جسے خود اپنا ہوش نہیں ہے، اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا چاہتی ہیں، لیکن میں بتولن بی سے کیسے یہ سب کہہ سکتی تھی۔ میں تو صرف اندر ہی اندر ڈرتی رہی۔

آخر ایک دن وہی ہوا کہ سحر کی خالہ بتولن بی کے اشارے پر لکھنؤ سے عبدالرحمٰن کی خالہ فریدہ بیگم اور خالو اختر سبحانی دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ مٹھائی، کپڑے، زیور اور ڈھول باجے کے ساتھ سحر کا رشتہ مانگنے بتولن کے گھر آ گئے۔ خالہ جنہوں نے عبدالرحمٰن کو پالا پوسا تھا، شاید ان کی اپنی اولاد بھی ہوتی تو اس جانفشانی سے اس کی دیکھ ریکھ نہیں کرتیں۔ ایک تو بے ماں باپ کا بچہ، دوسرے ان کی پیاسی گود نے پوری طرح سے عبدالرحمٰن کو اپنے آپ میں سمولیا۔ کچھ اس طرح سمولیا کہ دن کو دن، رات کو رات نہیں سمجھا۔

درحقیقت عبدالرحمٰن خالص اسلامی طرز کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن خالہ کی خواہشوں کے آگے خاموش ہو گئے۔ سنجیدہ مزاج تھے اور تہذیب و آداب کی ایسی روایات میں پلے بڑھے تھے کہ اگر کسی بات پر انہیں اختلاف ہوتا تو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے مگر اپنی زبان سے کچھ نہ کہتے۔ اور یہ تو وہ خالہ تھیں جنہوں نے نہ جانے کتنی راتوں کی نیندوں کو حرام کر کے انہیں اپنے سینے سے لگا کر پالا تھا۔ ان کے حکم کو ماننا اپنا دین و ایمان سمجھتے تھے۔ خالہ خالو کو وہ اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتے تھے اور اتنا ہی احترام کرتے تھے۔

انہیں سحر اور بتولن بی کے بارے میں پوری تفصیل سے ساری باتیں بتا دی گئی تھیں۔ کہاں رہتی ہیں، کیا کام کرتی ہیں، کون سے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، پہلے کیا تھیں اور اب کیا ہیں۔

خالہ خالو نے بھی آج کل کی جدید طرز کی لڑکیوں کی بیبا کی کو دیکھ کر سوچا کہ کسی بھی اوسط درجے

کے گھرانے میں شادی کر کے عبدالرحمٰن کو اُلجھا دیا جائے۔ عبدالرحمٰن بھی خالہ خالو کے سامنے جھک کر ان کی خوشنودی کے لیے دل و جان سے راضی ہو گئے۔ جن راہوں پر خالہ خالو نے ایک رہبر بن کر سمت دِکھائی، اسی سمت پر وہ بھی گامزن ہو گئے۔

خالہ پھولی نہ سماتی تھیں۔ بہن بہنوئی کی یاد انہیں تڑپاتی رہی۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، آنکھوں کو دوپٹے کے کونے سے خشک کرتی رہیں۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ ان کے بیچ میں عبدالرحمٰن ایک واحد اولاد تھی۔ بہن کے انتقال کے بعد فریدہ بیگم نے بچّے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بہن کی نشانی کو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا تحفہ سمجھ کر اپنی زندگی کا ایک ایک پل اس بچے پر نچھاور کرتی رہیں۔ بہن کے گزر جانے کے بعد چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ بہنوئی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عبدالرحمٰن صرف سات ماہ کے تھے کہ خالہ کی سونی گود میں ہمکنے لگے۔ دائی، نوکر، آیا اور حالی موالی سے ان کا گھر بھرا رہتا تھا۔ بچّہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اگر کبھی اس کی طبیعت خراب ہو جاتی تو سارا گھر رات بھر جاگ جاتا۔

ماں باپ کی دولت تو تھی ہی، خالہ خالو کی حیثیت بھی کچھ کم نہ تھی۔ اختر سبحانی صاحب کا تعلق کسی نواب خاندان سے تھا۔ عبدالرحمٰن کا عقیقہ اس دھوم دھام سے ہوا تھا کہ جیسے کسی شادی میں بھی شاید ایسے تکلّفات نہیں ہوتے ہوں گے۔ گھر کے باہر، سرخ خیمے میں طوائفوں کے ناچ کا انتظام ہوا تھا۔ لوگوں نے رات بھر طوائفوں کا ناچ دیکھا اور گھر کی خواتین کھڑکیوں اور دروازوں سے ان تماشوں کا لطف لیتی رہیں۔

فریدہ بیگم نے سحر کو دیکھ کر خدا کا شکر اَدا کیا۔ وہ دل ہی دل میں اس قدر خوش تھیں کہ چہرے سے وہ خوشی صاف نمایاں ہو رہی تھی۔ انہیں اس بات کا بالکل ملال نہیں تھا کہ لڑکی والوں کی اچھی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ انہوں نے بتولن بی کی اجازت سے سحر کی اُنگلی میں انگوٹھی

ڈال دی اور سحر پر اپنے آپ کو وارتے ہوئے گلے سے لگالیا۔ سحر نے بھی بجھے بجھے دل سے ان حالات کو قبول کرلیا اور اپنی بربادی کو اپنی ہی نظروں سے دیکھتی رہی۔ یک بیک بتولن بی کے آنگن میں ڈھول اور گیتوں کے شرارے پھوٹنے لگے۔ ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں گونجنے لگیں۔ بتولن بی کی آنکھوں سے اشک رَواں ہونے لگے۔ ایسے مبارک موقع پر انہیں سرکار بہت یاد آرہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تو تھے، لیکن چہرہ بہت ہی مطمئن تھا۔ عبدالرحمٰن کے گھر والے ان کو بہت پسند آئے۔ کسی سے کہنے لگیں۔

''اجی شادی لڑکا لڑکی سے خالی تھوڑا ہی ہوئے ہے۔ اجی ای (یہ) تو دو خاندان کی شادی ہووے ہے۔''

دونوں خاندان میں اتحاد پیدا ہونے کے اثرات انہیں صاف صاف نظر آرہے تھے۔ منگنی ہوگئی اور جنتری دیکھ کر ایک بہت ہی مبارک سی تاریخ چن کر شادی کا دن طے کردیا گیا۔

اب بتولن بی کی بے قراری شروع ہوئی۔ اندر ہی اندر انہیں سحر کی فکر تھی لیکن بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک رہنے کی کوشش میں تھیں۔

''دیکھو بابو، نئے گھر جاؤ گی جہاں نئے نئے لوگ ہوں گے۔ ان سے کیسے بات کروگی، چیت کروگی، ای سب تم سوچ لو۔ دیکھو ای تمرا اول جلول والا حساب نا چلے گا۔ سب سے تمیج (تمیز) سے بات کریہو۔ اپنے چال ڈھال پر دھیان دیہو سحر۔ دیکھو بابو، سب کا دل موہو گی تب ہی تورے (تم کو) بھی پیار ملے گا۔ بغیر سیوا میوہ ملتے سنے ہو بیٹی، نانے (نہیں نا) اور بنا دُکھ کے راحت کہاں۔''

وہ ایک فلسفی کی طرح اپنی باتیں کہے جارہی تھیں اور سحر تو خدا جانے ان کی باتیں سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ بالکل خاموش نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ بتولن بی کہتی جارہی تھیں۔

''دیکھو سحر، سسرال جو جاؤ گی تو ہوئیں (وہیں) سے قبرستان جئیہو (جاؤ گی) یہاں آدے کا

جرورت (ضرورت) نا ہے۔لڑکی کا اصل گھر سسرال کا گھر ہوئے ہے۔ای جندگی (زندگی) میں سب سے بڑی چیز عزّت آبرو ہے بابو، اور کچھ نا۔"

بتولن بی تعلیم یافتہ تو نہ تھیں لیکن غلط سلط تلفظ میں ہی سہی، زندگی کے تعلق سے دانشورانہ باتیں کرتی جا رہی تھیں۔اصل تعلیم تو انہیں زندگی کے تجربوں سے حاصل ہوئی تھی اور نیکی کا شعور انہیں فطری طور پر ودیعت تھا۔اپنے شعور اور تجربوں کا نچوڑ وہ سحر کو گھول کر پلا دینا چاہتی تھیں۔

"لڑائی جھگڑا، ہلّہ ہنگامہ سے دُور رہیو سحر۔اللہ رسول ﷺ کی بات کو دل میں بسا لو سحر تو تورے سے کوئی بھی گناہ نا ہوگا۔اگر ای بھول گئی تو تم جانو اور تمرا عاقبت۔ای جو آج کل چھوکڑین (لڑکیاں) سب اپنے اپنے میاں کو ورغلا دیں ہیں تو کا اپنے ہی میاں کی عاقبت خراب کریں ہیں کی، کا کوئی دوسرے کو کچھ تھوڑا ہی ہووے ہے۔سمجھتی ہیں کہ چلو مائے کو او کے (اس کے) بیٹا سے چھڑا دیا، مگر نا۔او تو اپنے میاں کا خرابی کر ڈالیں ہیں۔ماں تو چھٹ گئی مگر ایک دن تو اللہ تعالیٰ کے بڑے دربار میں جانا ہی ہے، تب ہواں (وہاں) کا کریں گے۔"

سحر خاموش ہی رہی۔اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی تو کچھ اور تھی، جواب پارہ پارہ ہو کر بکھر چکی تھی۔دل میں سوچ رہی تھی کہ ارادہ ایک الگ چیز ہے اور اس کا پورا ہونا دوسری چیز۔اس انجان شخص سے میرا کیا واسطہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی انجان شخص اب میرے ہر لمحے کا مالک و مختار بن جائے گا۔

آج سحر کی شادی تھی۔ مہندی اور ابٹن کی خوشبوؤں سے اس کا بوسیدہ چھوٹا سا گھر مہک اُٹھا تھا۔ چھوٹے سے آنگن میں لال مَڑوہ بھی لگا دیا گیا تھا جس سے شادی کا پورا سماں بندھ گیا تھا۔ سحر اپنے کمرے میں بالکل خاموش بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے خود کو حالات کے تند و تیز دھاروں پر بس بہتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ لہریں اسے جہاں بھی چاہیں، لے جائیں۔ اسے کوئی فکر نہیں تھی۔

''اب میرا جو بھی حشر ہو، میں کچھ نہیں جانتی۔''

میں اس کے پاس صبح سے جانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن جیسے میری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے گھر کی طرف جانے کے لیے میرے قدم اُٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ یا اللہ میں جاؤں تو کس طرح جاؤں، میں سحر سے کیا باتیں کروں گی۔ اسے کس طرح سے تسلّی دوں گی۔ آخر کار میں ہمت کر کے شادی والے روز سحر کے گھر چلی گئی۔ کیسے نہیں جاتی۔ مجھے تو سحر کے پاس جانا ہی تھا، سو میں چلی گئی۔

مشہور عرب مورّخ مسعودی نے اپنی کتاب ''مروّج الذہب'' میں لکھا ہے کہ خدا نے جنت سے حضرت آدمؑ کو جزیرۂ لنکا میں ایک پہاڑ پر اُتارا اور اس پہاڑ پر جنت کی وہ پتیاں بھی تھیں جن سے حضرت آدمؑ نے ستر پوشی کی تھی اور جب وہ پتیاں خشک ہوگئیں تو ہواؤں نے ان کو اُڑا کر پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ غالباً اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں پتیوں کی وجہ سے ہندوستان میں خوشبودار عطر پائے جاتے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اور کیا وجہ ہے، لیکن سرزمینِ ہند عود، لونگ، مشک اور دوسرے قسم قسم کے عطر کے لیے خاص ہے (''مغل شہنشاہوں کے شب وروز''۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن)

ایک عرب سیاح نے ۱۴ھ میں حضرت عمرؓ سے بیان کیا تھا کہ ہندوستان کا دریا موتی، اس کا پہاڑ یاقوت اور اس کا درخت عطر ہے۔ (سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن)

بتولن بی کے گھر میں داخل ہوئی تو قسم قسم کی خوشبوؤں نے جیسے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان کے گھر میں سجاوٹ دیکھی تو اپنی آنکھوں پر جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کٹاری ٹولہ کے اس بوسیدہ سے مکان کی دیواروں پر اور ان دیواروں کی دراڑوں پر رنگ برنگے تازہ پھولوں کی ایسی خوشبودار لڑیاں کچھ اس طرح سے جھول رہی تھیں کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ بتولن بی کی مالی حالت تو نہ جانے کب کا دم توڑ چکی تھی مگر پھر بھی اپنی اوقات کے مطابق انہوں نے ان سارے خوش نما تازہ پھولوں سے سحر کے لیے گھر کو سجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

انہوں نے محلے کے کچھ لوگوں کی مدد سے اپنے گھر کو یوں سجایا تھا جیسے ایک مالن اپنے چمن کی چمن آرائی کر رہی ہو۔ مہنگی اور قیمتی چیزیں نہ سہی، کائنات کی گود میں کھلے پھولوں کی ڈالیوں سے، ہر رنگ کے تازہ پھولوں اور ہری پتیوں سے گھر کے ایک ایک حصّے کو سجا ڈالا تھا۔ جو آتا، ان کی پُرانی تہذیب کی خوش مذاقی سے بے حد محظوظ ہوتا۔ شاید ان کے سرکار اگر زندہ رہتے اور ان کا بزنس بھی قائم رہتا تو وہ اپنے شاندار بنگلے میں موتی، یاقوت یا زمرد کی لڑیوں سے جا بجا سجاوٹ کرتیں۔

واقعی یہ دیدہ زیب سماں جو بتولن بی نے خوش ذوقی سے اپنے گھر میں باندھا تھا وہ کسی اوراق مصور کی سیر سے کم نہیں تھا۔ گرچہ انہیں معلوم تھا کہ ان سجاوٹوں کا سحر پر کوئی اثر نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر کے گھر کو سجایا۔

انہوں نے جن پرانی رسموں کا انتخاب کیا تھا اس کی نفاست اور لطافت سے وہ سحر کی شادی کے جشن میں ایک نکھار لانا چاہتی تھیں۔

''دیکھو بابو'' کسی سے کہتیں ''نکاح کے وقت سحر کے لیے پھولوں کا زیور بنوایا ہے۔ یاد دلا دوگی بابو، دل ودماغ قابو میں نا ہے بابو۔ دیکھو دلہا آوے گا تو پہلے شربت دیا جا گا پھر پان کا بیڑا اور جب نو باد چُن لے گا تو اوکا (ان کا) گال دیا سے سیکا جائے گا اور خالی گال سیک کے چھوڑ مت دوگی جی۔ سر ضرور جھکا ئیو تب نے دلہا اپنی دلہن کے سامنے جھکا رہے گا۔''

کبھی زاروقطار روتیں، کبھی کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔ شاید وہ قہقہوں میں سحر کی سسکیوں کو چھپانا چاہ رہی ہوں۔ کبھی بیٹھی بیٹھی اپنے ہی کھٹولے پر گیت گانے لگتیں۔

میرا جگر ٹونا کوئی دیکھو رے

دکھلا وہو رے...... میرا اجگر ٹونا

باہر بیٹھا بنا میرا مسند ایسا

ارے لاڈو کے آگے بلیا ایسا رے

بلیا کا بچوا ایسا رے...... میرا اجگر ٹونا

نہ جانے کتنے ٹونے، شہانے اور سہاگ کے گیتوں کے صرف ایک ایک لائن گاتیں اور کبھی پورا گیت اپنی روئی روئی اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں گا کر ختم کر دیتیں۔ ان کو گاتے دیکھ کر محلّے کی دوسری خواتین بھی ان کے ساتھ راگ ملانے کو بیٹھ جاتیں لیکن بتولن بی کی آواز سب سے جدا تھی، سب سے مختلف۔ کسی کے سُر اور لَے کو جانچنے اور پرکھنے کا انہیں کوئی بھی دھیان نہیں رہتا۔ دل کے اندر جو بھی ہو رہا ہو، مگر ظاہری طور پر خود کو پُرسکون ہی دکھاتیں۔ ناخوش گوار حالات کے اثر کو برداشت کرتی ہوئی وہ کمرے، آنگن اور دالان کر رہی

تھیں۔ایک جگہ پر بیٹھے بیٹھے بے قراری ہوتی تو دوسری جگہ اُٹھ کر چلی جاتیں۔ محلّے کی لڑکیاں آنگن کے ایک کونے میں بچھی ہوئی ایک چٹائی پر بیٹھ کر شادی کے گیت گا رہی تھیں:

ہاں جی بیٹی، سہلی میونیاں مت کھیلو

دمدوا آ کے لے جا گا جی

ایک کوس گئی بیٹی ......دو ہی کوس گئی

جب پردہ اُٹھا کے دیکھا، نیہر بڑی دور بسے جی

ہاں جی بھیا اماں کا سنگ چھوڑیہو، بہن تمری دور بسے جی

محلّے کی خواتین یکے بعد دیگرے سحر کے گھر میں داخل ہوئی جا رہی تھیں۔ بتولن بی کو مبارک باد دیتیں، تھوڑا سا بیٹھتیں اور پھر روانہ ہو جاتیں۔ بتولن بی کسی سے گلے مل کر روتیں، کسی کو دُعائیں دیتیں۔ لڑکیاں بدستور اپنے گانوں میں منہمک تھیں:

بھیا کو دیو اماں محلا دو محلا، ہم کو دیو پردیس رے سن بابل مورے

کاہے کو بیاہی بدلیس رے سن سکھی بابل مورے

حضرت امیر خسرو نے ہند اسلامی تہذیب کے دو مختلف سُروں میں ایک ایسا امتزاج، ایک ایسا رنگ پیدا کر دیا تھا کہ شادی کے گانوں میں انتہائی درجے کا سوز و گداز اُنڈ کر ہر سننے والے کے دلوں کو بے قرار کر دیتا تھا۔ سننے والوں کے لیے ہندی اور ایرانی راگوں کے مختلف رنگوں میں عشق کی کشمکش، سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ اور محبت کی داستانوں کو ایسے گھولا تھا کہ ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اسی سے طرح طرح کے رنگ اُبھرتے چلے آ رہے تھے۔

انہیں گیتوں کے شراروں میں تخت پر پان بچھا کر سحر کو آنگن میں لا کر سات سہاگنوں نے نہلایا اور پھر

اسی پان کے بیڑے بنوائے گئے جورات میں دولہے کو کھلایا جاتا تھا۔ بتولن بی کے پاس اتنے پیسے تھے ہی نہیں کہ وہ بہت ساری چیزیں سحر کے لیے خرید تیں، لیکن جن چیزوں کو وہ شادی کے موقع پر ضروری سمجھتی تھیں، انہوں نے منگوا لیے تھے، جیسے سحر کو غسل کے وقت خوشبو دار مسالے لگوائے جن میں صندل، مشک، عنبر، زعفران اور عود کے بھی اجزا تھے۔ بالوں کے لیے خوشبودار تیل منگوائے۔ پھلواری شریف سے خاص اُبٹن منگوایا جس کو دلہن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر مل کر دلہن کا زرد رنگ نکھارا جاتا ہے اور وہ اُبٹن عورتوں کے ہاتھوں سے عود، نارنگی کے پھولوں کا عرق، نارنگی کے چھلکے اور گلاب وغیرہ ملا کر بنوائے جاتے تھے۔

میں پہلے سے ہی اِدھر اُدھر چھپی ہوئی تھی۔ سحر نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ آنگن سے پان کے پتوں پر نہا کر کمرے میں آئی تو مجھ اس سے نظریں چار کرنی ہی پڑیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے لیے سحر کی یہ دل خراش سسکیاں رُوح فرسا اور جانکاہ تھیں۔ میرا دل اس کی ناکام حسرتوں کے بین پر ڈوبنے لگا۔ سحر مجھے کس قدر عزیز تھی! بالکل چھوٹی بہن کی طرح۔ میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جسے اس نے کسی قیمتی گوہر کی طرح تھام لیا تھا۔ اس کے اَن بہے آنسو بھی میرے دل کے رُخساروں کو بھگو دیا کرتے تھے۔ اس کی اَن سنی چیخیں میری سماعت میں خراشیں پیدا کرتی تھیں۔ میرے بس میں نہ تھا کہ میں ظالم زمانے سے اس کی خوشیاں اور اس کے لبوں کی مسکراہٹ چھین لاتی۔ میں نے ایک قیمتی خزانے کی طرح اس کے کانپتے وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اس کی پشت پر دلاسے کی تھپکیاں دینے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ یہ دلاسہ اس کے غموں کا مداوا نہیں بن سکتا، لیکن اس کے علاوہ میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

ہندو مسلمان سبھی گھرانوں کی خواتین اور مرد حضرات سحر کی اماں کی حالت سے پوری طرح واقف تھے اس لیے سب لوگ شادی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھے۔ بتولن بی کا معمول تھا کہ روز صبح اپنی دبیز چادر اوڑھ کر اپنے گھر سے نکلتیں اور سب سے تھوڑی تھوڑی باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھتی

جاتیں۔اس لیے محلّے کے سارے لوگ ان کو بخوبی جانتے تھے۔صرف جانتے ہی نہیں بلکہ ان سے مل کر ان کی باتوں کو سن کر بہت ہی محظوظ ہوتے تھے۔

بتولن بی نے کچھ لوگوں کی مدد سے رنگین کاغذ اور کپڑوں کو کتروا کر اپنے دروازے کے باہر سڑک کی طرف والے حصّے کو بھی سجوایا تھا۔اس گلی میں صبح سے ہی شور شرابا تھا کہ آج سحر کی شادی ہے۔وہ صرف اپنی ماں کی ہی بیٹی نہیں تھی بلکہ پورے محلّے کی بیٹی تھی اور سارے لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے یعنی ہر دل عزیز تھی۔

گھر کے سامنے والی سڑک کے نکڑ پر ہی باراتیوں کے لیے خیمہ لگوایا گیا تھا۔سڑک سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں پر یہ سارا انتظام ہوا۔دلہا کے بیٹھنے کے لیے ایک سرخ تخت اور باراتیوں کے لیے کرسیاں لگائی گئیں۔باراتی بہت کم آنے والے تھے اور چار سمدھنیں آنے والی تھیں۔عبدالرحمٰن زندگی کی سادگی میں ہی یقین رکھتے تھے۔وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل شخص تھے۔انہوں نے سحر کی اماں کو کہلوا دیا تھا کہ انہیں کچھ نہیں چاہیے۔وہ سادگی سے شادی کی ساری رسومات کو انجام دینا چاہتے ہیں، لیکن ادھر ان کی خالہ کے سینے میں ہزاروں ہزار تمنائیں کروٹیں لے رہی تھیں۔بتولن بھی اپنے سرکار کو یاد کر کے جتنا کچھ کر سکتی تھیں، اپنی اوقات سے زیادہ ہی کر رہی تھیں۔انہیں خوشی اس بات کی تھی کہ سحر کی شادی ایک اعلیٰ خاندان میں ہو رہی ہے۔وہ بھی رشتہ ایسے وقت میں ملا جب کہ وہ سحر کے لیے اس قدر پریشان تھیں۔شہزاد کے ماں باپ نے جس طرح سے ان کی غربت کا مذاق اُڑایا تھا، وہ ان کی نظروں کے سامنے ایک ڈراؤنا خواب بن کر انہیں ستاتا تھا۔کچھ ایسا خیال بھی آتا کہ کاش وہ اس محلے ہی میں نہ آتیں۔نہ یہاں آتیں اور نا ہی شہزاد سحر پر ایسا فریفتہ ہوتا اور نا ان کی اس قدر بے عزتی ہوتی جس کا غم انہیں اُٹھتے بیٹھتے کھائے جا رہا تھا۔

شام کے وقت قریب چھ بجے لکھنؤ سے بارات آ گئی۔ دولہا سمیت صرف پندرہ باراتی اور سمدھنیں آئیں۔ باراتیوں کو اسی خیمے کے اندر لے جایا گیا اور خواتین سحر کے گھر آ گئیں۔ باراتی جدھر جدھر سے گزرتے آداب و تسلیمات، مزاج گرامی، بحمد اللہ جیسے الفاظ بکھرتے جاتے۔ سنجیدہ مزاج، مسکراتے چہرے، تہذیب و آداب کی قدروں سے سرشار سبھوں سے گلے ملتے رہے اور ہاتھ ملاتے رہے۔ وضع داری تو جیسے ان لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لباس پر بھی لکھنوی تہذیب کی ایک پختہ چھاپ نظر آ رہی تھی۔ کوئی اچکن پائجامہ ٹوپی میں تھا تو کوئی کالی شیروانی اور سفید چست پائجامہ میں چمکیلی چھڑی کے ساتھ۔ باراتی آ کر خیمے کے اندر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ادھر براتیوں میں محلّے کے لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنے اپنے گھروں سے آ کر باراتیوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سحر کی امّاں کے گھر میں مرد کی کوئی صورت تو تھی ہی نہیں۔ لے دے کر ایک خالو تھے جو تن تنہا باراتیوں کی خاطر مدارت میں لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے گھر سے بھیا لوگ بھی باراتیوں سے ملنے گئے تھے اور پھر ان لوگوں کی خاطر میں اور مہمان نوازی میں آگے آگے رہے۔

عبدالرحمٰن گرچہ سحر سے عمر میں کافی بڑے تھے لیکن صورت و شکل کے بُرے نہیں تھے۔ چہرے پر ایک خاص وقار تھا۔ حوصلہ مندی اور اخلاقی قوّت و طاقت لیے ہوئے جھک جھک کر سبھوں سے مل رہے

تھے۔ کریم کلر کی شیروانی جس پر ہلکا سا سلمیٰ اور ریشم کا کام تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے باراتیوں سے ذرا منفرد اور خاص لگ رہے تھے۔ زبان اس قدر شائستہ کہ سننے والا سنتا ہی رہ جائے۔ سنہرے کالا بتو سے کیا ہوا کام والا سلیم شاہی جوتا آج بھی پہنے ہوئے تھے جو کہ ان کے سنہرے کام کی شیروانی پر خوب بچ رہا تھا۔ ان کا پورا سراپا ہی بہت باوقار لگ رہا تھا۔

سحر کی امّاں نے گھر کے اندر سمدھنوں کے لیے دالان میں الگ سے ایک تخت لگا دیا تھا۔ دولہے کی امّاں اور رشتے کی بھاوج سب ملا کر پانچ خواتین تھیں جو اس تخت پر بیٹھی آپس میں گپیں کر رہی تھیں۔ کسی کے چہرے سے ایسے تاثرات عیاں نہیں ہو رہے تھے کہ وہ لوگ کسی چھوٹے اور غریب انسان کے گھر کی مہمان ہیں۔ خاکساری اور اعلیٰ انسانی اقداریں ان کی نس نس میں پیوست تھیں۔ وہ اپنی اخلاقی قوت و طاقت کی بدولت بتولن بی کے گھر کی سادگی اور مہمان نوازی کو دیکھ کر بہت متاثر ہو رہی تھیں۔

بتولن بی نے گلاب اور موتیے کے ہار سمدھنوں کو مسکرا مسکرا کر پہنائے۔ عطر لگایا اور گلاب پاشی کا جو انتظام کروا کر رکھا تھا وہ بھی پورا کیا۔ اس کے بعد گانے والیوں سے چھپے چھپے انداز میں چند گالیاں بھی دلوائیں اور سمدھنوں نے بھی مسکرا مسکرا کر ان گالیوں کو سنا اور محظوظ ہوتی رہیں۔ اس کے بعد سے بتولن بی گھر میں بوکھلائی بوکھلائی سی اِدھر سے اُدھر پھرتی رہیں۔ کبھی کچھ بھول جاتیں کبھی کچھ یاد آ جاتا۔ اکیلی خاتون جن کے ذمّے بہت سارا کام تھا، جو کہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس پر اکلوتی بیٹی کی جدائی کا احساس۔

لکھنؤ میں مسلمان بیگمات کا لباس زیادہ تر شادی بیاہ کے موقعے پر غرارے ہی ہوتے تھے۔ دولہا کی امّاں سے لے کر سبھی خواتین قیمتی بھاری کامدار غرارے قمیضیں اور دوپٹے میں ملبوس تھیں۔ نفیس اور قیمتی لباس میں سب کی سب بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ پھر بتولن بی ان سبھوں سے گلے ملیں اور ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔ وہ ان سبھوں کے شریف، شائستہ اور لکھنوی مزاج کو دیکھ کر بہت ہی متاثر ہو رہی

تھیں اور خوش بھی ہو رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں کہ:

''ارے میری سحر ان لوگوں میں بالکل مل جائے گی۔ ارے وہ تو خود ہی عقل و دانش کی پیکر تھی۔ غیرت و عفت کی دیوی تھی لیکن شہزاد نے اسے اس قدر ورغلایا کہ وہ اپنا راستہ ہی بھٹک گئی۔ ایک ایسے راستے پر چلنے لگی جہاں سے ہم دونوں کو رُسوائی ہی نصیب ہوئی۔''

پھر دل ہی دل میں اپنے معبود سے سحر کے لیے دُعائیں کرنے لگیں۔

''میرے اللہ میری سحر اور اس کے شوہر کے بیچ میں ایک ایسا محبت کا چراغ جلا دیجیے جو کبھی نہ بجھے۔''

وہ خود بھی تو معاشرے کی ایک مثالی خاتون تھیں جو سراپا مہر و وفا کا پیکر تھیں۔ اپنے سرکار کو انہوں نے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کی اور مشکل وقت میں بھی صبر و سکون کے ساتھ زندگی کے دن گزارتی رہیں۔ انہوں نے سحر کو بھی اسی طرح کی تعلیم دی تھی، لیکن قسمت میں جو لکھی ہوئی تھی اس رُسوائی کو بھی انہیں برداشت کرنا پڑا۔ وہ پست ہمت تو تھیں نہیں، زندگی کی راہوں پر اپنے قدم جما کر چلتی گئیں، لیکن کوئی کیا کرے اگر تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہی ہے تو وہ ہو جائے۔ اور تقدیر کے سامنے تو وہ بالکل مجبور تھیں۔ ان کی زندگی میں کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ آخر ان سارے حادثات کو انہوں نے برداشت کیا ہی، تو پھر اب جو بھی ہو رہا ہے اسے بھی انہیں برداشت تو کرنا ہی تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

سحر چاندی کے طبق کے چھاپ کی لال ساڑی اور ہرے رنگ کا چھاپا ہوا پوری آستین کا شلوکہ (بلاؤز) پہن کر کسی گٹھری کی صورت اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ صندل، مشک، عنبر اور عود کی خوشبوؤں سے بسی بسائی، بکھرے ہوئے کھلے بالوں پر چھاپی ساڑی کا ٹکا ہوا، گھنے چھاپ کا آنچل، اس کی صورت پر بے پناہ زیب دے رہا تھا۔ ہونٹوں پہ مسّی اور ناک میں تنکے والی کیل سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی تھیں۔ اس کے بستر پر ہی چاندی کا طشت تھا جس پر پانچ سونے کے تار کھینچ کر ریشم میں گوندھ کر دونوں ہاتھوں کے لیے

رکھے تھے۔ ساتھ میں ناک کے لیے نتھ جس میں سفید سچا موتی اور ایک یاقوت کی موتی بیچ میں اٹکا تھا۔ سحر کے اِردگرد اس محلّے کی کچھ سہیلیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ اب تو اس کے دل نے بھی دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک سکتے کے عالم میں بدحواس بیٹھی تھی اور اپنے آپ کو، اپنی ذات کو جیسے سبھوں کے حوالے کر چکی تھی اور اپنی بربادی کا پورا تماشا دیکھنے کے لیے تیار تھی۔ ٹھان چکی تھی کہ جو بھی ہو رہا ہے وہ ہوتا رہے۔ کسی نے کہا کہ ہاتھ بڑھاؤ، اس نے ہاتھ بڑھا کر مہندی بھی لگوالی۔ ماں کی ہدایت پر قُم قتی سنہری چوڑیاں بھی پہن لیں جو کہ اس کی گوری گوری سڈول کلائیوں پر بہت ہی زیب دے رہی تھیں۔

رنگ مہندی کا نہیں یہ ہو نہ ہو عاشق کا خوں

آج ہے اس شوخ کے سرخی کمال انگشت پر

(بہادر شاہ ظفرؔ)

بتولن بی نے سحر کے لیے بیلے، چنبیلی، جوہی سے تیار کیا ہوا گلے کے لیے پھولوں کا ایک خاص ہار بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ پھولوں کے زیور میں کانوں کے لیے جھومک، مانگ کے لیے ٹیکا اور ہاتھوں کا کنگن بھی چمپا کی معطر اور سنہری کلیوں سے بنوایا تھا جو کہ خاص نکاح کے وقت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

نکاح کی اجازت لینے کے لیے مولانا صاحب دو گواہوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ایک شور سا ہو گیا: ''ہٹو ہٹو، مولانا صاحب اجازت لینے کو آرہے ہیں''۔ اس چھوٹے سے گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ سحر کو چاروں طرف سے محلّے کی عورتوں نے اور سحر کی سہیلیوں نے گھیر لیا تھا۔ بتولن بی لنگڑاتی ہوئی زور زور سے سانس لیتی ہوئی سحر کے کمرے میں آئیں اور سحر کے بہت ہی قریب بیٹھ گئیں۔ سبز مغزی والی چھاپے کی ایک لال دوہر، جو بتولن بی نے خاص اسی وقت کے لیے چھپوائی تھی، خواتین اور مولانا صاحب کے درمیان کھینچ دی گئی اور مرد عورتوں کا کسی حد تک پردہ ہو گیا۔ مولانا صاحب نے سحر سے عبدالرحمٰن کے

ساتھ بعوض پچاس اشرفی مہر معجّل اس کا نکاح پڑھانے کی اجازت طلب کی۔

''منظور ہے؟''

سحر نے امّاں کے ہاتھ کو اپنے کاندھے پر محسوس کیا اور اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی تھرتھراتی ہوئی آواز میں ''جی'' کہہ کر ایک سیکنڈ میں بیاہتا کہلانے کے فرض کو انجام دے کر اپنی پُر بہار زندگی سے بہت دُور چلی گئی تھی۔ شہزاد کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے سارے امکانات بس اس پل ختم ہو چکے تھے۔ ساری خواتین ایک دوسرے کو مبارک ہو، مبارک ہو، کہہ کر صدائیں لگا رہی تھیں۔ بتولن بی کے آنسو تو جیسے تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

سحر کی خالہ فہیمن، بہن کے پاس آ کر گلے ملیں اور بہن کو دلاسہ دینے لگیں:

''ہائے کاہے اتنا روؤ ہو بوبو۔ ہائے اِہی دن کے لیے رات رات بھر نا ستیو (سوتی) تھی۔ ہائے سب کا نے بیاہ ہووے ہے بوبو......''

بتولن بی روتے روتے ایسی بے حال ہوگئیں کہ دیوار پر سر ٹیک دیا۔ ایک خاتون لپک کر جلدی جلدی انہیں گلاس سے پانی پلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''ہم ٹھیک ہیں بابو، ہم ٹھیک ہیں۔ بس ایسے موقعے پر سرکار بہت یاد آ رہے ہیں۔ کا بتاویں، ہائے میرے سرکار کے نصیب میں ای (یہ) خوشی نا تھی...... ہائے ای خوشی دیکھے بغیر میرے سرکار ای بھری دُنیا میں ہم کو اکیلے ٹمٹماتا ہوا چھوڑ کے چلے گئے......''

اور اس ہنگامے سے بے نیاز سحر ایک ویران اور خالی خالی سی کیفیت میں ڈُوبی ہوئی تھی۔ اسے اس وقت ہوش ہوا جب بتولن بی اسے لپٹا کر زار و قطار رونے لگیں۔ سحر بھی ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سحر روتے روتے بے حال ہورہی تھی۔ فیمن خالہ نے کمرے میں موجود ساری خواتین سے باہر جانے کی التجا کی۔

''ہائے بابو میری کیسی بے حال ہورہی ہے۔ ذرا سا آپ لوگ اس کو آرام کرے دیجئے۔ ایسے ہی دھان پان سی میری بیٹی ہے اور روتے روتے جیسے بے دَم ہوئی جارہی ہے۔ جایئے آپ لوگ جایئے بھائی...... بہت ہی عاجزی سے کہنے لگیں۔

اس ہنگامے میں سحر تو کہیں اور ہی کھوگئی تھی۔ اس سے مزید بیٹھا نہیں جارہا تھا۔ وہ اس وقت کسی بوسیدہ سے مکان کی دراڑ شدہ دریچے سے کسی زرد بیل کی طرح چپکی ہوئی گم سم سی اپنے تکیے سے چپکی ہوئی تھی۔ مسلسل دُکھ اور سوچ وفکر سے اس کا دماغ تھک چکا تھا اور اس نے تھک کر سب کے جانے کے بعد اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپالیا تھا اور خاموش ہوکر ہلکی ہلکی نیند میں ڈوبی جارہی تھی، جیسے اس پر بے ہوشی طاری ہوئی جارہی ہو۔

خوابوں کو بُننے والی آنکھوں نے، اس کی سانسوں کے تسلسل کے ساتھ ساتھ، تھوڑا سا اپنا زاویہ بدل کر کسی اور ہی سمت کی طرف رُخ کرلیا۔ سحر کے کانوں میں شہزاد کی کہی ہوئی باتیں بار بار ٹکرانے لگیں۔ اسے خود پر تو افسوس تھا ہی، لیکن اس نیم خوابی میں بھی شہزاد کے ان لفظوں کو یاد کرکے دل پاش پاش ہوا جارہا تھا......

''میں مانتا ہوں سحر، یہ محبت کے راستے بہت کٹھن ہیں، لیکن یہ نہ بھولو کہ تم نے اپنے پورے ہوش وحواس میں مجھ سے محبت کی ہے اور تم نے ایسا کیا تو تمہیں اسے نبھانا بھی ہوگا۔ ایک بار کسی طرح سے محبت کو حاصل کرلو، مجھے تم اپنا بنالو، پھر یہ دونوں جہان ہم دونوں کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ ساری مصیبتیں، ساری کی ساری اذیتیں ہم دونوں سے دُور چلی جائیں گی۔ تمہارا یہ عکس جو میرے وجود پر دن رات چھایا رہتا ہے وہ اگر مجھے چھوڑ دے گا، تمہارا سایہ مجھ سے دُور چلا جائے گا، تو پھر میں کیا اور میرا جینا

کیا۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا۔ میں تو در بہ در مارا پھروں گا۔ میری وقعت کیا رہ جائے گی۔ شاید میں ایک فقیر بن جاؤں یا کسی درگاہ کا ایک میلی سی چادر میں لپٹا ہوا ایک مجاور۔"

ایسے کسی تصور سے بھی سحر کانپ اُٹھی۔ وہ اپنے بستر سے یک بیک اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور باہر دریچے سے سڑک کی ٹمٹماتی مدھم سی روشنی میں جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سحر نے وضو کیا اور اپنے کمرے میں واپس آ کر جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ دُعا کے لیے جیسے ہی ہاتھ اُٹھایا تھا کہ آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ اس نے شہزاد کے لیے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کی۔ وہ خود کو شہزاد کا ایک مجرم سمجھنے لگی تھی۔

میں خود بھی اذیت میں ہوں اور اسے بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اسے یاد آنے لگا...... شہزاد کہہ رہا تھا:

"یہ پل...... یہ پل...... سحر، اگر گزر گیا...... اس پل کو روندتی ہوئی اگر تم آگے بڑھ گئیں تو تم ایک دن پچھتاؤ گی۔ پھر تم مجھے اور میری باتوں کو یاد کرنا......"

سحر اس کی باتوں کو یاد کر کے زار زار رونے لگی۔ ایک برچھی سی تھی جو کلیجے کے پار ہوئی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی......

"شہزاد وہ کون سا پل ہے جب میں تمہیں یاد نہیں کرتی ہوں، لیکن میں بے حد مجبور ہوں۔ اتنی مجبور کہ شاید ہی کبھی کوئی اس جہان میں اتنا مجبور رہا ہوگا۔ تم اپنی سحر کو معاف کر دینا شہزاد۔"

سحر نے اپنی ماں کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ وہ اپنی ماں کی ہدایتوں کو ذہن میں رکھ کر کسی بھی سنگار کی رسموں کو کرنے کے لیے منع نہیں کر رہی تھی۔ چھاپی لال ساری اور پھر خوشبودار پھولوں کا زیور پہن کر سحر کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں شادی کے موقع پر دلہن کو چاندی کے طبق کی چھاپی ساری اور تازہ پھولوں کے زیور سے سجانے کی روایت میں ایک مصلحت بھی ہے۔ یہ شہانہ جوڑا

غریبوں کے لیے بھی ہوتا تھا اور امیروں کے لیے بھی، لیکن اطلس وکمخواب اور ریشمی کپڑوں کے آگے، لال ساڑی پر چاندی کے طبق پر جامے دار چھاپ کی قیمت کیا۔ اور سونے چاندی، ہیرے جواہرات کے سامنے جوہی چنبیلی، بیلے اور چمپا کی کلیوں سے بنے زیور، جو روم روم میں تازگی بھر دیتے ہیں اس کی اہمیت کیا ہے، لیکن جو حسن دلہن کا چھاپی ساری اور تازہ پھولوں میں نکھرتا ہے وہ کسی بھی قیمتی لباس میں نہیں نکھر سکتا۔

سحر کے حسن میں چھاپی ساری اور تازہ پھولوں کے زیور سے چار چاند لگ گیا تھا۔ نرم آواز، کم گو، پاک دامن اور فرماں بردار ایک ہندوستانی لڑکی کے جو اوصاف ہونے چاہئیں، اس کی وہ پیکر نظر آ رہی تھی۔

ماں کی باتوں کو سن کر سحر کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔ ہر کوئی یہی سمجھ رہا تھا کہ لڑکیاں اپنے گھر کو چھوڑتے وقت اسی طرح سے روتی ہیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ سحر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کئی ہفتوں، مہینوں کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے وہ تھک چکی تھی۔ اپنے اس فیصلے سے اندر ہی اندر تڑپ رہی تھی۔ ماں کو جب خوش دیکھتی تو سوچتی......

''میری بوڑھی ماں...... جو زندگی کی تگ و دو میں، گلی گلی کی دھول اُڑا کر چار پیسے گھر میں لاتی تھیں۔ یہ شادی میں اپنی ماں کی خوشی کے لیے کر رہی ہوں...... یہ خوشی میں انہیں انعام کی صورت میں پیش کرتی ہوں۔ اگر وہ اپنے گھر کو کلیوں پھولوں سے، خوشبوؤں سے سجا کر خوش ہیں تو وہ میرے لیے کافی ہے......''

سحر نکاح کے جوڑے میں سجی سجائی بے معنی سی، مختلف خیالوں میں محو اپنے کمرے میں کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ شادی سے ایک دن قبل بتولن بی لنگڑاتی ہوئی سحر کے کمرے میں گئیں۔ سحر نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور اپنی نظروں سے ایک سوال کیا...... اماں اب کیا چاہتی ہو، میں نے تم پر اپنی محبت کو قربان تو کر دیا...... بتولن بی پہلے تو سحر کے بستر کے کونے پر بیٹھ گئیں اور تھوڑی دیر خاموش رہیں۔ اس کے بعد بہت ہی دھیمے لہجے میں سحر کو مخاطب کیا۔ ان کے جوشیلے جملے، قسم قسم کے محاورے اور زور دے

دے کر باتیں کرنا، سب کافور ہو چکے تھے۔ وہ کہنے لگیں:

''آ بیٹی میرے پاس آ''۔ سحر تھوڑا کھسک کر ماں کے قریب ہو گئی۔ ''تو کا سمجھ رہی ہے بیٹی ہم کا تیرے دُشمن ہیں......نہیں نا۔''

سحر نے بھی بہت آہستہ سے سر ہلا کر ماں کی تائید کی۔

''نہیں میری بابو، ہم تیرے دُکھ کو جانے ہیں بیٹا۔ ہم نا جانے ہیں کی، ای تم اٹوائی کھٹوائی لے کے کاہے پڑی ہو۔ میرے سب پتہ ہے۔ ایک پھول سے مالا نہیں بنے ہے میری بابو۔ او (اس) گھر میں جاتی تو کا تیرے کوئی عجت (عزت) ملتا بیٹی۔ نا نے ملتا (نہیں ملتی)۔ پھر ایسے گھر کو ہم کاہے دیکھیں۔ توں (تم) ہی بتاؤ نا۔ تمری ایہی ٹوٹی ڈیوڑھی اچھی ہے بیٹا۔ ساری جندگی (زندگی) یہی ڈیوڑھی پر بیٹھی رہ جاتیو (جاتی) بابو مگر او محل کو دیکھے کو بھی نہ جاتی۔ او گھر کو تم آنکھ اُٹھا کر بھی کاہے دیکھو۔ اپنے دل پر اتنا بوجھ نہ لے بیٹا۔ او سب بھول جا۔ دیکھ تیرا اسرال کتنا اچھا ہے......''

اب بتولن بی کا موڈ ذرا ذرا بدل رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر خوشی کے آثار لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر وہ کہنے لگیں:

''ارے تیری ساس تو ابھی ہی سے تیرے پرواری نیاری جا رہی ہے۔ کیسے ہنس ہنس کے تو کو دیکھ رہی تھیں۔ ہواں (وہاں) تو کو عجت ملے گا بیٹی۔ اُن لوگ، سحر دیکھ، تو کو (تم کو) اپنے گھر کی رونق بنا رہے ہیں، بہت مان سمان ملے گا۔''

ماں کی ان ساری باتوں کو سن کر سحر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ پھر ساون بھادوں کی ایسی جھڑی لگی کہ اسے روکنا محال ہو گیا۔ بتولن بی نے بھی روتے روتے سحر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دینے لگیں۔ وہ سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ سحر کی حالت سے وہ بے خبر نہیں تھیں۔ انہیں پتہ تھا کہ سحر کے

دل پر کیا گزر رہی ہے، لیکن وہ مجبور تھیں۔ انہیں اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ارے بیٹی، تیرے سے جو غلطی ہوگئی، اس کو درگزر کر، مگر پھر بھی ہم آج تک یہی سوچیں ہیں کہ بیٹی تو ماں کی تصویر ہووے ہے (ہوتی ہے)۔ میری بیٹی ہو کر تیرے سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی۔ غریب لوگ کو بہت قدم پھونک پھونک کے چلنے پڑے ہے بابو۔ ای دُنیا بڑی خراب ہے بیٹی۔"

سحر تو یہ ساری باتیں بہت پہلے سے ہی جانتی تھی، لیکن پھر بھی ماں کی یہ ساری باتیں اسے سننا ہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ان کی باتوں کا جواب دیے جا رہی تھی......

"آپ کے اعتبار کو کبھی بھی اب ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی اماں...... میں نے شہزاد سے محبت کر کے بہت بڑی بھول کی......"

آج تو بتولن بی اپنے مزاج کے برعکس ذرا اچھے اور دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھیں ورنہ ایک دو دن قبل ہی وہ بالکل لال پیلی ہو کر سحر سے کہہ رہی تھیں:

"ارے ہم تو ای گلی میں چلنے کے لائک (لائق) نا رہے لڑکی۔ تم تو میرے کہیں کا نا چھوڑیو (نہیں چھوڑا) سحر۔ لوگ گلی میں داہنے بائیں سے گزریں ہیں تو میرے لگے ہے کہ سب لوگ ہم کو گھور رہے ہیں۔ کا جانے کاہے آنکھ اُٹھایا نا جاہے۔ ہائے آج کا سے کا ہو گیا۔"

آج پھر سحر کو ماں پر بہت ترس آ رہا تھا۔ وہ پریشان بھی تھی اور پشیمان بھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ حویلی میں جا کر میں نے سب کی برابری کی تو آج اس کی یہ سزا ملی۔ نہ ہی میں سب کی برابری کرتی اور نہ آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔ مجھے تو حویلی میں کام کرتے رہنا چاہیے تھا۔ صرف کام۔ باورچی خانے کا کام۔ مجھے پڑھنے لکھنے کی، ریڈیو سننے کی کیا ضرورت تھی...... مجھے تتلیوں کی طرح اُڑنے کی کیا ضرورت تھی...... یہ میں نے کیا کیا۔

بتولن بی جیسا کہ بتاتی تھیں، ان کے پاس قسم قسم کے جڑاؤ اور سادی زیورات تھے، لیکن قسمت نے

ایسا پلٹا کھایا کہ بوقت ضرورت، بھاری بھاری زیورات بکتے گئے اوراس سے گھر کے ضروری اخراجات پورے ہوتے گئے۔ زیور میں صرف ایک ہریا جگنو، ہاتھ کی پتلی سی کنگنی، جھومک اورایک نتھ رہ گئی تھی جسے بتولن بی سنبھال سنبھال کرر کھتی رہیں کہ سحر کی شادی کے وقت کام آئے گا اور آج رات وہ وقت سامنے آ کر کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مالی حالت نے کبھی انہیں اور کچھ بنوانے کی اجازت دی ہی نہیں تھی۔ زیادہ تر عورتیں زیور کو اپنی زندگی میں بہت اہمیت دیتی ہیں لیکن اہمیت دینے کے باوجود دوسرے اخراجات کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتے ہیں، جیسے کھانا پینا، ڈاکٹر حکیم، دوادارو۔ ایسے ہی دوسرے اخراجات میں وہ سارے خوب صورت زیورات پگھلتے گئے۔ بتولن بی کے دل پر ہرایک زیور کے بکنے کے بعد ایک چوٹ سی لگتی گئی۔ کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ وہ کن کن اذیتوں سے گزر رہی ہیں۔ بس گھر کی ہر بات پر وہ پردہ ڈالتی گئیں۔

اچھے دنوں کا حسین محل جیسے چند سالوں میں ہی کھنڈر بن کر اُبھرنے لگا اور وہ اس کھنڈر کے عقب میں اس کی بھربھری دیوار کا کمزور سہارا لے کر ایک کمزور ناتواں عمر رسیدہ خاتون اسے ہی کھڑی کی کھڑی تکتی رہ گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہر چیز ہی ان سے چھنتی چلی گئی۔

وہ اپنے معبود سے بس یہی دُعا مانگتیں:

''یا خدا! میرے دل کے اس بوجھ کو کم کردے۔ میرے جسم اور دماغ میں بس اتنی توانائی دے دے کہ میں سحر کو اس کے گھر کا بنانے کے قابل ہو جاؤں۔ اسے رخصت کردوں۔ پھر میرا کیا، اکیلا پیٹ کسی بھی ڈیوڑھی پہ جا کر پال سکتی ہوں۔ یہ اکیلا پن تو اب میرے ساتھ ہے اوراب تو لگتا ہے کہ ساری زندگی ہی میرے ساتھ رہے گا، لیکن اے مولا! مجھے یقین ہے کہ تیری رحمتوں اور قدرتوں سے مجھ جیسے کمزور انسان کو بھی طاقت مل سکتی ہے۔''

ڈھول اور گیتوں کے شور میں سحر کے دل سے نکلی ہوئی سسکی کسی کو کب سنائی دے رہی تھی۔ رنگین تتلیوں کی اُڑان اور دھنک کے رنگوں کا عکس جو تیرتے ہوئے اسے چھو کر گدگدایا کرتے تھے وہ زمین پر اُتر کر نہ جانے کس اندھیرے سمت میں کھو گئے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ کمرے کی سجاوٹ اور چنبیلی، بیلے، گلاب کی خوشبوؤں سے بے خبر اس کے اندر ایک ایسا لاوا پھوٹ رہا تھا کہ جس نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ اس نے پوری دانستگی سے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا یعنی بے حسی کا سرخ جوڑا پہن کر اپنی سجی سجائی پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تک نہیں تھا۔ صرف ماں کو کہتے سنا تھا......

''ارے اگر پندرہ سال تو (تم) سے بڑا ہے تو کا (کیا) ہوا۔ ہے تو کھاندانی (خاندانی)۔ کھاتے پیتے گھر کا ہے، ارے گھی کا لڈو ہے، گھی کا لڈو۔ اور تو کو (تم کو) کا چاہیے سحر......''

یہ سب سن کر سحر تو مرجھا ہی گئی تھی۔ کہاں اس کے خوابوں کی رنگینیاں اور کہاں ماں کی ایسی ایسی باتیں۔ آخر کار جس رات کا اسے انتظار نہیں تھا، وہ رات اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جس خمار کو لے کر وہ اپنے عروس شب میں داخل ہونا چاہتی تھی وہ تو کب کا اس سے بچھڑ چکا تھا۔ ٹونا، شہانہ اور سہاگ کے گیت یکا یک مدھم پڑنے لگے۔ شہنائی کی تان جیسے ٹوٹنے لگی۔ یہ تو اسی کا سجا سجایا کمرہ تھا جہاں وہ انجان بنی بیٹھی تھی۔ اس کے حسین تصوّرات قطرہ قطرہ ٹپک کر اس کے آنسوؤں کے ساتھ سرخ جوڑے میں گم ہوتے

چلے گئے۔ اب وہ کسی کی ہو چکی تھی۔

شوہر کو دیکھ کر سحر کا پھول سا دل اس کے اپنے ہی کلیجے پر سل کی طرح بھاری ہو گیا۔ بوجھل رات بھی جلتی ہوئی شمع کے ساتھ گھڑی کی ٹک ٹک کو گنتے گزر گئی اور اس سیاہ رات کو کچھ ابر پریشاں جیسے کسی گم گشتہ جزیروں کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے کسی زخمی رُوح کی طرح نا معلوم سمت کی طرف کھو گئے۔

نیند بھی آئی تو چند لمحوں کے لیے سہی، سہمی سہمی، ڈری ڈری سی، کمرے کی رنگ برنگی سجاوٹ اور پھولوں کی خوشبوؤں کے درمیان بھی بغیر کسی ماہتاب کے اور بغیر کسی گلابی خواب کے۔ اس چند لمحوں کی نیند سے جاگی تو اس نے اپنی ذات پر ایک سائے کو پھیلتے دیکھا جو کسی کی قربت میں تنہائی کا صحرا تھا۔ آخر کار ضبط کا ہاتھ تھام کر اُس نے مقدّر کے آگے سرخم کر دیا اور خود کو سمجھاتی رہی کہ یہی تقدیر کا لکھا تھا، سو وہ پورا ہو گیا۔ دل میں ایک چبھن سی ہوئی تو سوچنے لگی کہ خواب جب گر کر چکنا چور ہو جاتے ہیں تو اس کی کرچیاں چبھیں گی ہی۔

جو بچھڑ گیا سو وہ بچھڑ ہی گیا۔ چلو میں اب اس کی راہوں کو تکتی تو نہ رہوں گی جو میں ہمیشہ سے کرتی آ رہی تھی۔ وہ تو ہر بات کے لیے تیار تھا، لیکن میں ایک بے بس لڑکی اس کا ساتھ کہاں دے سکی۔ ایک زندگی ہی نا کاٹنی ہے، سو میں کسی طرح کاٹ لوں گی۔

صبح ہونے کو آئی۔ مرغوں کی بانگ اور مسجدوں سے فجر کی اذانوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ لوگ بستر سے اُٹھ کر نماز کی تیاریوں میں لگ گئے۔ عبدالرحمٰن نے بھی گھر کے دالان میں آ کر وضو کیا اور سحر کے کمرے میں آ کر جائے نماز بچھا کر نماز فجر اَدا کی اور آہستہ سے کمرے سے نکل کر باہر کی طرف چلے گئے جہاں باراتیوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

رُخصتی کی تیاریوں میں صبح سویرے سے ہی بتولن بی لگ گئیں۔ سحر کے لیے جو ساز و سامان مہیا

کر سکتی تھیں، اس میں کوئی بھی کسر نہ چھوڑی۔ گلابی رنگ سے رنگی ٹوکری میں کئی درجن پوریاں قلعی کیے ہوئے تانبے کی دیگ میں کئی عدد مرغ مسلّم، مٹھائیاں اور سمدھی سمدھنوں کے لیے تھال وغیرہ بنوا چلی تھیں۔ ایک زمانے سے تھوڑا تھوڑا سنجو سنجو کر ساری چیزیں جمع کر رہی تھیں۔ بس ایک ہی خیال سے دل ڈُوبا جا رہا تھا کہ سحر کے بغیر اب اس گھر میں وہ کس طرح رہیں گی، لیکن ان کی خوشی کی بھی تو کوئی انتہا نہیں تھی کہ اللہ اللہ کر کے سحر کی شادی ہو گئی۔ اپنے معبود کے آگے ہر لحہ شکر گزار تھیں اور ہر نماز کے بعد شکرانے کی نفل پڑھتی جا رہی تھیں۔

آخر رُخصتی کا وقت آ گیا۔ سحر اپنے شہانے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔ محلّے کی ساری خواتین رُخصتی کے وقت سحر کے گھر پر آ گئی تھیں۔ کوئی اپنے آنچل سے آنکھیں پونچھ پونچھ کر سحر کو روایتی طور پر سمجھا رہی تھیں اور کوئی بتولن بی کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو ہمدردی میں خشک کر رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں آنگن میں چٹائی پر بیٹھ کر بدائی کے گیت گا رہی تھیں:

ہاں جی بیٹی سیلی میونیا مت کھیلو، مدوا آ کے لے جا گا جی

ماں نے کالے رنگ کا برقع لا کر بیٹی کو دیا۔

"پہن لے بیٹی، جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ لوگ تجھے تیار ہونے کو کہہ رہے ہیں سحر۔"

دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو پڑیں۔ عبدالرحمٰن کو باہر سے بلوایا گیا اور دولہا دلہن کی گھر بھرائی کی رسم اَدا کی گئی۔

رُخصتی کا مرحلہ آن پہنچا۔ عبدالرحمٰن موقع کی نزاکت کا احساس کر کے ایک طرف ہو گئے لیکن بتولن بی نے عبدالرحمٰن کو کہا کہ دلہن کی کانی اُنگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چلیں۔ بتولن بی اپنی بانہوں میں سحر کو سمیٹے ہوئے باہر کی طرف چلیں۔ ایک ایک قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ سحر کی سسکیاں تھم نہیں

رہی تھیں۔ بتولن بی کی ناتوانی کا احساس کر کے سحر کو ایک طرف سے میں نے تھام لیا تھا۔ آنگن سے باہر نکلتے ہی ناگاہ میری نظر سامنے اُٹھ گئی۔ سڑک کی پَر لی طرف شہزاد کھڑا تھا، لیکن کس حال میں......؟ چہرے اور آنکھوں میں ایسی ویرانی تھی کہ دل کانپ اُٹھا۔ ہفتوں کی بڑھی ہوئی شیو نے جھاڑ جھنکاڑ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میلے چکٹ کپڑے بدن پر جھول رہے تھے۔ میری نگاہ اس کے سراپے پر سے گزرتی ہوئی ہاتھ پر ٹھہر گئی جس میں کسی نرم کپڑے کی نیلی دھجی تھی۔ غیر ارادی طور پر سحر کے بازوؤں پر میری گرفت سخت ہوگئی۔ سحر نے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور میری نظروں کے تعاقب میں اس کی نگاہ بھی شہزاد پر جا کر ٹِک گئی۔ سحر کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ شہزاد نے خالی خالی ویران نظروں سے اسے دیکھا۔ بتولن بی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سحر کو مضبوط گرفت میں تھامتے ہوئے کار میں عبدالرحمٰن کے پاس بٹھا دیا۔

''جاؤ ہو بابو، تمہیں اللہ کے بعد اپنے شوہر کے سپرد کیا۔ اپنا بھی خیال رکھیو ساتھ میں اپنے شوہر کا بھی۔ گھر والوں کو سکھ پہنچائیو تو سکھی رہیو۔''

کار روانہ ہوگئی۔ سحر کی ساری سہیلیاں بھی اسی وقت اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ چند خواتین بتولن بی کی دل جوئی کے لیے رُک گئیں۔ میں مضطرب انداز سے دروازے کی اوٹ سے شہزاد کو دیکھنے لگی۔ وہ شکستہ حال دیوانہ گاڑی کے پیچھے اُڑتی گرد پر نظریں مرکوز کیے کھڑا تھا۔ اس کا پورا سراپا غبار آلود تھا۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے انجانی سمت میں وہ چل پڑا۔ اس نامراد پر آخری نظر ڈال کر میں بتولن بی کے پاس لوٹ آئی۔

بتولن بی بس اپنے آنچل سے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی سحر کو یاد کرتی رہیں۔

''اللہ اوک (اس کو) دُنیا جہان کی خوشیاں دے۔ او (وہ) کُھس (خوش) تو ہم بھی کُھس۔''

تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر انہیں تقویت پہنچانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر میں اپنے گھر واپس آ گئی۔

سحر کے ساتھ اس کے سسرال فہیمن خالہ گئی تھیں جس کی وجہ سے بتولن بی کو بہت ڈھارس تھی۔

''اے فہیمن! دیکھ بابو ای (یہ) لڑکی تو ہوش میں نا ہے۔ اس لڑکی کو ہوواں (وہاں) سنبھالیو فہیمن۔ اللہ جانے ای لڑکی کیسے سسرال میں رہے گی۔ ذرا دم دلاسہ دیتی رہوگی بابو۔''

فہیمن خالہ نے بہن کو تشفی دی اور سحر کے ساتھ اس کے سسرال روانہ ہو گئیں۔ سحر کو تو جیسے کوئی ہوش ہی نہ تھا۔ چند دنوں سے وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ جس طرف موڑا جا رہا تھا، اسی طرف گھوم جاتی تھی۔ اپنی زندگی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی تو صرف خواہشوں اور خوابوں کی شکستہ صداؤں کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔

محبت جو زندگی بخش ہوتی ہے، سحر کے لیے درد و کرب اور اذیت کی علامت بن چکی تھی۔ اس کے اندر اب نہ زندگی باقی تھی اور نہ ہی احساسِ زندگی۔ صبح کو شام کرنا ہی اب اس کے نزدیک زندگی کی مکمل تفسیر تھی۔ مجھے سحر کی اندرونی کیفیت اور شکستہ جانی کا پورا پورا اندازہ تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ آج شہزاد کو جس عالم اور کیفیت میں دیکھنا میرے لیے اس قدر تکلیف دہ تھا، سحر کے اوپر اس منظر نے تو قیامت ہی برپا کر دی ہوگی۔ پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوا ہوگا، نہ جانے اذیت کے کس پُلِ صراط سے وہ گزری ہوگی۔ خدا جانے اس نے خود کو کس طرح سنبھالا ہوگا۔ اسے ایک نئی جگہ پر ایک نئی حیثیت، نئے رُوپ میں داخل ہونا ہے۔ اللہ ہی جانے ہوش و حواس سے بیگانہ، شکستہ حال، ناتواں لڑکی کا اس کے سسرال میں کیسا استقبال ہوا ہوگا۔ میں اپنے اندیشوں میں گرفتار، کسی انہونی کے خدشے میں مبتلا، لرزتی رہی۔ مجھے سچ مچ سحر کی بہت فکر ہو رہی تھی۔

عبدالرحمٰن کی خالہ کے دل میں بیٹے کی شادی کا ارمان تو ایک مدّت سے تھا۔ نماز پڑھتیں تو ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتیں:

"اے پروردگار! تو نے جو میرے سینے میں ممتا کی تڑپ سموئی ہے، اس کی لاج رکھنا۔ میرے بچّے کو دُنیا جہان کی خوشیوں سے نواز دینا۔ عبدالرحمٰن میری زندگی کی ایک واحد دولت ہے اور یہ دولت میرے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ رہے۔ اس کی خوشی اور اس کی صحت میرے لیے سب کچھ ہے۔ جس طرح سے اب تک میں نے اس کے وجود کے اُجالے میں خود کو منور رکھا ہے، میری باقی زندگی کو بھی اسی طرح گزار دے۔"

عبدالرحمٰن کے گھر پر دلہن کے استقبال کے لیے ایسی سجاوٹ تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر دنگ تھے۔ ان کے گھر میں ساز وسامان کی کثرت تھی۔ ہر طرف رنگ و سرور کا ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ گھر کا ڈرائنگ روم، جو کافی کشادہ تھا، وہاں موٹی دری کا فرش لگا ہوا تھا جس پر سفید براق سی چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ لوگ فرش سے پرے، جوتے اُتار اُتار کر فرش پر یکجا ہو رہے تھے۔ ایک طرف دلہا دلہن کے لیے لال مخمل پر کارچوبی کام کی مسند لگی تھی اور اسی مسند پر ایک بہت بڑا، اسی رنگ کا گاؤ تکیہ، سہارا لگا کر بیٹھنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پر مٹھائیوں کے تھال بھی رکھے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم سے متصل، ڈائننگ روم میں فرش پر ایک لمبا چوڑا دسترخوان لگایا گیا تھا جس پر انواع واقسام کے پُرتکلف اور عمدہ کھانے چنے گئے تھے۔ چاندی کے ظروف میں

کھانے کی قسم قسم کی عمدہ چیزیں رکھی تھیں۔قورمہ، قلیہ، کباب، پراٹھے، شیرمال، تنجن، مرغ کے اسٹو وغیرہ کی اشتہا انگیز خوشبوئیں نہ صرف فضا کو معطر کیے ہوئے تھیں بلکہ بہترین ذائقے کا احساس دلا رہی تھیں۔عبدالرحمٰن کی شادی کے جشن کا یہ خاص اہتمام ماں باپ نے مل کر مہینوں کی تیاریوں کے بعد کیا تھا۔گھر کیا تھا لکھنؤ کے مسلمانوں کی عمدہ تہذیب کا ایک شاہکار تھا۔

فہیمن خالہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں، عبدالرحمٰن کی امّاں نے بہت ہی پُر جوش استقبال کیا۔ وہ آگے بڑھیں اور فہیمن خالہ کو گلے لگالیا۔سحر کے ساتھ صرف فہیمن خالہ آئی تھیں اور ساری خاطر داری اور مہمان نوازی انہیں کے لیے ہو رہی تھی۔شہر کے کچھ رشتہ داروں اور قرابت داروں کو فہیمن خالہ اور سحر کے استقبال کے لیے بلایا گیا تھا۔

فریدہ بیگم اور اختر سبحانی ہر جگہ جا جا کر تمام انتظامات کا بہ نفسِ نفیس جائزہ لے رہے تھے اور گھر کے سبھی کام کرنے والوں کو ضرورت کے مطابق ہدایتیں دے رہے تھے۔ان دونوں کو ابھی دوسرے دن ہونے والے ولیمے کے جشن کے لیے بھی انتظامات کرنے تھے۔

پھر ایک شور ہوا کہ دلہن آگئی، دلہن آگئی۔

عبدالرحمٰن کی امّاں فریدہ بیگم خوشی خوشی دوڑ کر دروازے تک دلہن کے استقبال کے لیے آگے بڑھ گئیں۔سحر کے اندر گھر میں آتے ہی ساس نے بہو کو گلے سے لگالیا۔گھر میں یک بیک شہنائی گونجنے لگی۔ عبدالرحمٰن خاموش سے تھے لیکن ماں کو دیکھتے ہی مسکرا اُٹھے اور ماں کے گلے لگ گئے۔ماں نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر عبدالرحمٰن ماں سے پھر لپٹ گئے لیکن ایک ملال سا دل میں رہ رہ کر انہیں اُداس کر دیتا تھا۔ ماں کو اس بات کا کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ وہ ماں سے الگ ہو کر جلد ہی دوسرے مہمانوں کی خاطر مدارات میں محو ہو گئے۔شائستگی، تمیز داری اور مہمان نوازی ان کے خاص جوہر تھے۔سچ تو یہ تھا کہ وہ خود کو

مشغول رکھ کر کسی درد کو چھپانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتے جاتے کہ زندگی میں تو ہر حال میں کشمکش ہے اور یہ ازل سے ہے، لیکن اپنے قدم کو جمائے رکھنا ہے۔ آگے مدد تو وہی کرتا ہے جو سب کا پالن ہار ہے۔ ماں اور باپ کی اعلیٰ تربیت، ضبط کی تعلیم اور حق گوئی کے سبق نے انہیں ایک ایسی طاقت دی تھی کہ انہیں اپنے آپ پر پورا بھروسہ تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ ہر حال میں خوش رہیں گے۔ وہ خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ماں سے گلے ملتے وقت جوان کی آنکھیں بھر آئی تھیں وہ بس جذبات کی ایک وقتی کمزوری تھی اور کچھ نہیں، لیکن دل کے اندر ایک گہری چبھن تھی جو انہیں چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے شادی کے لیے اقرار کرنے میں دیر کر دی تھی لیکن اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ان کی دلچسپی کا مرکز و محور شعر و ادب اور علمی مطالعہ رہا۔ کتابوں کی وسیع دُنیا میں کھو کر وہ اپنے فطری تقاضوں سے بے نیاز رہے۔ جب ماں (خالہ) کا اصرار حد سے بڑھا، جنہیں گھر میں چھم چھم کرتی بہو لانے اور پوتے پوتیوں سے گھر میں اُجالا کرنے کی بیتاب خواہش تھی، تب مجبوراً انہوں نے شادی کے لیے حامی بھر دی۔ شادی کے لیے آمادہ ہو جانے کے بعد فطرت ایک خودرو پودے کی طرح سر اُٹھانے لگی تھی اور ان کے تصور میں ایک جھلملاتی ہوئی، شرماتی ہوئی، والہانہ نثار ہوتی ہوئی، ناز و اَدا دکھاتی ہوئی محبت جلوہ نما ہونے لگی تھی۔ ان کی عمر ضرور کچھ زیادہ ہو گئی تھی لیکن ان کے جذبات و احساسات نئے نویلے تھے، لیکن شب زفاف میں ہم سفر کی سرد مہری اور بے حسی نے ان کی اُمنگوں پر برف ڈال دی تھی۔ سحر کا وجود مشینی انداز میں ان کے اشاروں پر چلتا رہا۔ نہ گرمیٔ جذبات اور نہ ہی احساسات میں کوئی حرارت، ان کے دل نے دہائی دی۔ سحر تو یہ تمام چیزیں کہیں اور دان کر آئی ہے۔ وہ ایک سچے اور مخلص شخص تھے، اسی لیے اپنی رفیقِ حیات کے آئینے میں بھی ان کا تصور ایسا ہی تھا جو اب حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔

چار دنوں کے بعد سحر دسہرا کی رسم کے لیے لکھنؤ سے واپس پٹنہ اپنی ماں کے گھر عبدالرحمٰن کے ساتھ آ گئی۔ ہم لوگوں کو خبر تو ہو گئی تھی کہ سحر سسرال سے دسہرے کے لیے آ گئی ہے لیکن میری ہمت اس کے پاس جانے کی نہیں ہو رہی تھی۔ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں، کہ ایک دن شام کے وقت سحر چھپتی چھپاتی، سہاگ کی ساری ہی نشانیوں کو اپنے آپ پر چپکائے اور اوڑھے ہوئے باہر کے دروازے سے میرے گھر میں داخل ہوتی ہوئی مجھے نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی ہم سب دوڑے۔

''ارے سحر آ گئی...... سحر آ گئی۔''

مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی اور کہا، ''تم تو ہم سے ملنے نہیں آئیں نا؟''

میں نادم سی ہو گئی۔ پھر وہ تھوڑا ہنسی، لیکن وہ ہنسی اس کی وہ پہلے جیسی ہنسی نہیں تھی، جیسے وہ دل کے اندر سے ہنستی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی بے جان کینوس پر کسی کا اُجاڑ رُوپ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ میں دوڑ کر اس کے قریب چلی گئی اور اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں تو قدم بہ قدم اس کے ہر درد کے سفر میں اس کے ساتھ تھی۔ بھلا اس سے اس کی مسافت کا حساب کیا پوچھتی۔ مجھے تو سب کچھ پتہ ہی تھا، لیکن اگلے ہی پل میں نے اپنے شانے پر اس کے گرم گرم آنسوؤں کو جذب ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں تڑپ اُٹھی۔ یا خدا، تُو سحر کو صبر عطا کر۔ اس کی بیاہتا زندگی میں بہار لا دے۔ میں تو جانتی ہی تھی کہ سحر خوش نہیں ہے۔ میں نے قصداً

ہنسی والا موڈ بنا کر اس سے کہا۔

''ابھی تم کون سا ہمیشہ کے لیے سسرال جا رہی ہو سحر، جب جانے لگو گی تب خوب رو لینا۔''

لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سسکیاں، یہ آنسو اس کے دکھی دل کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

میں دوسرے دن سحر کے پاس جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ وہ پھر ہم لوگوں کے یہاں آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بتولن بی بھی لنگڑاتی ہوئی پہنچیں۔

''کا سحر، تورے پیر میں کا گھِرنی لگی ہے جی۔ بتاؤ، اونگوڑے دولہا کو ہواں (وہاں) اکیلے کمرے میں چھوڑ کے ہیاں دھم کچڑی (دھما چوکڑی) کرے کو آئی ہو جی۔''

حالانکہ دھما چوکڑی سے کیا واسطہ۔ سحر تو بالکل خاموش سی ہو رہی تھی۔ جیسے مجھ سے اپنی خاموش نظروں سے یہ پوچھ رہی ہو کہ بتاؤ اب کیا کریں، کہاں جائیں۔ لیکن بتولن بی تو اپنے حساب سے ہی باتیں کرتی تھیں۔ امّی نے پوچھا کہ سحر سسرال کب جا رہی ہیں؟ بس یہ پوچھنا تھا کہ بتولن بی شروع ہو گئیں۔

''اب ای نا جانیں۔ ہم بھلا کا جانیں۔ اب ان کا ای سب پھرج (فرض) ہے کہ دلہا سے بات کریں، پوچھیں کہ کب جائے کا ہے۔ ای بھلا ہم کا جانیں۔ مگر ای تو ابھی منھ ہی لٹکائے ہوئی ہیں۔ کا جانیں اب بے چارہ پھلم (فلم) والا ہیرو نا ہے، آدمی کا بچہ ہے۔ مگر نا، ان کا دماگ (دماغ) بھلا اتنا بڑا۔ اتنی عالم پھاجل (فاضل) ہو گئی ہیں، اب ان کو کا جانیں بھائی کا چاہیے۔ پوچھیے نا صاحب، ان ہی سے پوچھیے۔ ارے ہم کا بولیں۔''

مجھے لگا کہ بتولن بی بھی جیسے اداکاری کر رہی تھیں۔ انہیں سب کچھ پتہ تھا کہ معاملہ کس قدر نازک ہے اور سوچ رہی تھیں کہ نہ جانے اُونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ سحر یہ سب سن کر اس دن بالکل خاموش رہی۔ میں نے سحر سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے میری بات ٹال دی۔ ہاں ایک واقعے کی خبر مجھے ملی تھی کہ عبدالرحمٰن نے سحر سے کہا کہ فلمی گانوں کی کتاب کو جمعہ کے دن جلا دو ورنہ بہت گناہ

ہوگا، تو سحر نے وعدہ کیا کہ اگلے جمعہ کو ساری کتابیں وہ جلا دے گی۔ یہ سن کر واقعی میں بہت فکر مند ہوگئی تھی کہ انہوں نے سحر سے یہ سب کہا۔ میں نے بے قرار ہو کر سحر سے پوچھا۔

''کیا تم واقعی ساری کتابیں جلا دو گی؟''

سحر بولی، ''یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کیسا ہے وہ؟''

اس کا سوال چھن سے میری سماعت میں لگا۔ نظروں کے سامنے سے سحر کی رُخصتی کا منظر گزر گیا۔ ابھی کل ہی تو روشن بوا، امّی سے کہہ رہی تھیں کہ پیر صاحب کی درگاہ کے باہر درخت کے نیچے شہزاد بیٹھا تھا، عقل و ہوش سے بالکل بیگانہ۔

''سچ کہوں ہوں سرکار۔ دیوانہ مجذوب لگے ہے۔ ہاتھ میں ایک گندا سا چیتھڑا لیے اوکو (اس کو) نہار رہا تھا۔ او (اس) کے مائے باپ تو بیٹا کے دُکھ میں ایک دمے (ایک دم) پگلائے گئے ہیں۔''

میں نے سحر کے سرد ہاتھوں کو تھامے تھامے ساری رُوداد اُس کے گوش گزار کر دی۔

سحر کو پتہ تھا کہ وہ اب کسی کی ہو چکی ہے۔ شہزاد اس کی زندگی سے ہی نہیں بلکہ خود اپنی زندگی سے بھی دُور چلا گیا تھا، لیکن سحر کا دل جیسے اب تک اس کی تمنا میں گھلا جا رہا تھا۔ اسے شہزاد کے ساتھ بِتائی ہوئی شام یاد آنے لگی۔ اپنے گھر کے دالان میں بان کے کھٹولے پر بیٹھی بیٹھی وہ اپنے تصور میں شہزاد سے باتیں کرنے لگی۔

عبدالرحمٰن اپنے کمرے میں کسی ادبی رسالے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ ہی بڑبڑانے لگی......

''شہزاد، تم جس منزل پر مجھے لے جانا چاہتے تھے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہاں سے میری منزل کھو جائے گی۔ شہزاد، تم میری ایک نظم سنو گے...... ہاں سحر سناؤ، تم نے کیا لکھا ہے...... میں نہیں سناتی...... اس شہر کی پتھریلی فضا میں میری شیشے جیسی نظم چکنا چور ہو جائے گی۔ ایک زور کا چھناکا ہوگا اور میں لہولہان ہو کر رہ جاؤں گی...... مجھے بس تم اپنی خوشبوؤں میں رہنے دو۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے لوگ سکون سے رہنے کیوں

نہیں دیتے ہیں؟ چلو اگر تم میرے نصیب میں نہیں ہو تو نا سہی لیکن میں کسی اور کے بندھن میں نہیں بندھنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری یادوں کے سہارے یہ پوری زندگی گزار لوں گی۔ تمہیں یاد ہے جب ہم اور تم یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے ملے تھے، یعنی میری زندگی کا آخری دن جو تھا اس دن تم کس قدر بے قرار تھے۔ اس دن میں نے خود کو تمہاری بانہوں کے حلقے سے آزاد کرا لیا تھا۔ وہ لمحہ...... وہی لمحہ اب میرے لیے حاصلِ حیات ہے جس کا سہارا لے کر میں اس زندگی کو بہ آسانی گزار سکتی ہوں، لیکن یہ بات اپنی ماں کو میں کس طرح سمجھاتی۔ انہیں یہ بات کبھی سمجھ میں ہی نہیں آئے گی۔''

وہ اپنے خیالوں میں مگن، حال سے بے خبر، ماضی کے لمحوں میں اسیر، ساری باتیں سوچے چلی جا رہی تھیں کہ یک بیک بتولن بی کمرے سے نکل کر سحر کے پاس آ گئیں اور بہت آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔

''کمرے میں جاؤ بیٹا۔ اوہواں بے چارا کا کرے گا، بریڑی (چھت کی شہتری) تاکے گا؟''

سحر خاموش رہی۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے یا کہیں ہوا میں کسی خوش گوار فضا میں تیر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں جیسے اور بھی نشیلی ہوئی جا رہی تھیں، اپنے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی جیسے احساس ہی نہیں بچا تھا۔ سوچتی رہی کہ ماں کی باتوں کا جواب کیا دے، کہ بتولن بی پھر بول اُٹھیں۔

''کا ہوا بابو، ایسی کاہے ہو رہی ہو...... کا سوچو ہو...... ارے کاہے اتنا کڑھ رہی ہے بیٹا۔ ایسا فرشتہ صفت دلہا ملا ہے، اپنی تقدیر پر ناز کرو سحر...... ہائے ہائے نگوڑا ایک دم گائے ہے۔''

پہلے تو وہ جبراً ہی سہی اپنے چہرے پر ماں کی خوشی کے لیے ایک شگفتگی لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پھر بالکل خاموش ہو گئی۔ جولا وا اندر ہی اندر جوش مار رہا تھا، وہ آخر کب تک رُکتا۔ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ بتولن بی ایک دم سے پریشان ہو گئیں۔ اپنا ہاتھ اُٹھا کر انہوں نے سحر کے منہ پر رکھ دیا اور ویسے ہی آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔

''ہائے ہائے ای کا...... ای کا...... دولہا سن نہ لے بیٹا...... ہائے پاگل کا ہو گئی ہے، تو کو کا ہوا؟''

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ سحر کے رونے کی آواز عبدالرحمٰن کے کانوں میں جائے۔ سحر کو سنبھالنے میں خود کہیں، آنچل کہیں، کمر کا بٹوہ ہوا میں لہرانے لگا۔ بے چاری اپنی طاقت کے حساب سے سحر کو اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جانے لگیں۔ اسے زبردستی اپنے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹایا۔ سحر ماں کے بستر پر اوندھی پڑی بلک بلک کر روتی ہی رہی، بالکل دیوانوں کی طرح۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔ بتولن بی کو بھی اب اس کی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر پریشان ہے، لیکن آخر وہ بھی کیا کرتیں۔ کس طرح سحر کو شہزاد کے حوالے کر دیتیں۔ جس گھر کے سارے لوگ سحر کے خلاف تھے، جو سحر کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے، ان کے بیچ وہ اپنی بیٹی کو کس طرح پہنچا آتیں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ جا بیٹی، شہزاد کے ساتھ کہیں بھاگ جا۔

عبدالرحمٰن حسب عادت اپنے کمرے میں کوئی ادبی کتاب پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہ ساری کتابیں اس عرصے میں پڑھ ڈالی تھیں جن کے پڑھنے کی خواہش تنگیٔ وقت کی وجہ سے آج تک پوری نہ ہو سکی تھی۔ سحر پر اب جیسے بالکل ہی کوئی جن سوار ہو گیا تھا۔ وہ اب زور زور سے رونے لگی جیسے کوئی ہسٹیریا کی مریض ہو۔ ماں صرف اس کا منھ چھو چھو کر ''میری بابو، میری بابو'' کیے جا رہی تھیں۔ عبدالرحمٰن بھی ماں بیٹی کی ہلکی ہلکی گفتگو سن رہے تھے۔ گھر ہی کتنا بڑا تھا۔ آواز نہ کیسے آتی، لیکن جب سحر چلاّ چلاّ کر رونے لگی تو اس آواز کو سن کر وہ ننگے پاؤں بتولن بی کے کمرے کی طرف دوڑے۔

''کیا ہوا اماں...... کیا ہوا؟''

بتولن بی عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئیں۔

''نا بابو کچھ نا...... نا بابو کچھ نا...... اس لڑکی کو ایسے ہی پیٹ میں پیڑ (درد) اُٹھے ہے بابو۔ ای ایسے ہی ہو ہی جا ہے۔ تم جاؤ نا آرام کرو۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

سحر بستر پر لیٹ کر زار و قطار رو رہی تھی اور قریب ہی عبدالرحمٰن کھڑے سحر کو دیکھتے رہے اور دل

ہی دل میں اس چیخنے کی وجہ کا اندازہ لگانے لگے۔ اسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہو جا گا بیٹی...... ٹھیک ہو جا گا...... مت روؤ۔"

وہ سحر کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور اسے چپ کراتی رہیں۔ بتولن بی عبدالرحمٰن سے سب کچھ چھپانے کی کوشش بھی کرتی رہیں۔ وہ تھوڑی دیر وہاں خاموش کھڑے رہے، پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عبدالرحمٰن بہت پریشان ہو گئے، کہنے لگے۔

"اماں! میں جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔"

لیکن بتولن بی نے منع کیا کہ وہ ڈاکٹر کو نہ لائے۔ سحر یہ کو دورہ اکثر پڑتا ہی رہتا ہے اور وہ خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اب بتولن بی کی پریشانی پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سحر ان کی گرفت سے بالکل باہر نظر آ رہی تھی۔ سحر سے زیادہ اب انہیں عبدالرحمٰن کی فکر ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو بتولن بی کو سحر پر بہت غصّہ آنے لگا۔ اس بار وہ بھی اپنا ضبط کھو چکی تھیں۔ پہلے تو بیٹی بیٹی کرتی رہیں لیکن اب اس کا وقت جا چکا تھا۔ انہوں نے کمرے کو اندر سے بند کیا اور سحر پر برس پڑیں۔

"ارے منحوس ماری، تو تو میرے تگنی کا ناچ نچا رہی ہے۔ ای سب کا ہے۔ تیرا دماغ کہیں چَرے گیا ہے کا۔ ارے بتا نا میرے، ہم کا کرتے۔ تیرا ہاتھ پکڑ کے او محل میں پہنچا دیتے جہاں تو کو مڑ کے بھی کوئی نا دیکھتا۔ بول...... بول نا بھائی۔ ہائے، بھلا دولہا کا کہے گا، ایسی بدحواس رہے گی تو سسرال کیسے جا گی (جائے گی)۔ ہواں (وہاں) تو کو کون سنبھالے گا دماغ پھری۔ ارے تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟"

بتولن بی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سحر سے بات کرتے ہوئے ان کی سانسیں بھی پھول رہی

تھیں اور آنکھوں سے آنسو بھی اُمڈنے لگے تھے۔ سحر کا دل تو خود اس کے قابو میں نہیں تھا، اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ شہزاد سے اس انتہا تک محبت کرتی ہے۔ ایک نئی طرح کی بے چینی اس کی شادی کے بعد رنگ لائی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے گہرے درد کو وہ ماں کی لوری سے کس طرح بھلا دے۔ وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر پھر رونے لگی۔ اسے بری طرح سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو بے حساب دُکھ دے رہی ہے اور پریشان کر رہی ہے۔ بڑھاپے میں اگر وہ ایسی اذیت دیتی رہی تو شاید اس کی ماں برداشت نہیں کر پائیں گی، لیکن اس کا بھی اس طرح سے چیخ چیخ کر رونا بالکل فطری تھا۔ وہ اپنے دل سے مجبور تھی۔ یہی سب سوچتے وہ ماں کے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگی اور ماں سے معافی مانگتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کوئی نہ کوئی فیصلہ تو لینا ہے کہ وہ اب کیا کرے۔ اسے اپنے دل کو سمجھانا ہوگا...... اپنے آپ پر کنٹرول کرنا ہوگا۔

''اماں تم روؤ نہیں۔ میں بھی اب نہیں روؤں گی، تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ میں اپنے دل سے مجبور تھی اماں، لیکن میں اب سچ مچ بالکل ٹھیک ہوں۔ بولو یقین آیا تم کو۔''

بتولن بی ایک دم سے خاموش ہو گئیں اور سحر کے مزاج کا خاموشی سے جائزہ لینے لگیں۔ انہیں اب سحر کی باتوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ فوراً کہنے لگیں:

''ہاں بیٹا، میرے تو تیرے اوپر پورا بھروسہ ہے۔ تیرے پر نہ بھروسہ کریں گے تو اور کس پر کریں گے۔''

بتولن بی کو تھوڑا سا اطمینان ضرور ہوا لیکن سحر کی ان حرکتوں کی وجہ سے وہ اس پر اعتبار نہیں کر پا رہی تھیں۔ دل میں سوچتی رہیں...... ''ارے اس لڑکی نے تو آج خوب تماشا کیا'' لیکن اب کرتیں بھی تو کیا کرتیں۔ پھر سے بیٹی کی منت سماجت کرنے لگیں۔ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر جیسے بھیک مانگنے لگیں۔

''ایسے مت کر بیٹا۔ ارے میری بابو، ٹھیک سے رہ بیٹی۔ ایسا اول جلول کا ہے بولو ہو بیٹی۔ گھر میں نیا نیا داماد بیٹھا ہے، کا کہے گا او۔ بولو، ہائے او نگوڑا کا کہے گا۔ ہائے او کا کہے گا، سوچے ہو سحر؟ اپنا نصیب اپنے ہاتھ سے خراب کروگی بیٹا۔ کا یہی سوچے ہو۔ بولو، بولو نا بھائی۔''

سحر نے اپنا سر نفی میں ہلا کر ماں کی باتوں کا جواب دیا۔ بتولن بی نے پھر کہا۔

''تو پھر کا ہے ایسے ایسیک رو ہو۔ دل دُکھے ہے میرا۔ ذرا سوچو، ایسا بے منھ کا تو رے انسان ملا ہے، او کا عزّت کرو۔''

سحر پھر ماں سے لپٹ گئی اور انہیں یقین دلانے لگی کہ اب آئندہ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرے گی۔ پھر اپنے دُکھتے ہوئے جوڑوں کے ساتھ بتولن بی چہرے پر درد کے آثار لیے بڑی مشکل سے کھڑی ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔

عبدالرحمٰن کو بہت حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ سحر نے انہیں پسند نہیں کیا اور طبیعت کی خرابی تو صرف ایک بہانہ تھی۔ وہ شاید ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار بھی نہیں ہے، لیکن طبیعت میں اس قدر صبر واستقلال تھا کہ کوئی فیصلہ یک بیک جذبات میں آ کر لینا صحیح بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ اپنے کمرے میں ہی رہے۔ سحر نے کھانا لے جا کر کمرے میں دیا تو صرف یہی پوچھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟''

سحر نے جواب دیا، ''ٹھیک ہوں۔''

انہوں نے پھر پوچھا، ''ڈاکٹر کے یہاں لے چلوں سحر؟''

سحر نے دھیمے سے کہا، ''نہیں، میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں کبھی بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتی۔''

عبدالرحمٰن سحر کو اپنے کمرے میں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ انہیں خود ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی قسمت کے بارے میں کیا سوچیں۔ جب سے شادی ہوئی تھی بیوی نے سیدھے منہ ایک بات بھی نہیں کی۔ اُلٹ کر اپنے شوہر کو بھر نظر دیکھا تک نہیں۔ سحر کو اپنے کمرے میں کھانا لاتے دیکھ کر عبدالرحمٰن خود کو دلاسہ دینے لگے۔ صبر کی تلقین تو وہ دوسروں کو کیا کرتے تھے۔ سوچنے لگے کہ کسی نئے ماحول اور نئے شخص کے ساتھ قبول کرنے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہی ہے اور سحر بہت کم عمر بھی ہے۔ انہیں اپنی بدگمانی پر خود ہی غصہ آنے لگا......

''آج مجھے خود کیا ہو گیا ہے۔ کیا اللہ پر سے نعوذ باللہ یقین اُٹھ گیا ہے...... نہیں نہیں، سحر ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اسے کسی بھی طرح سے منا لوں گا، سحر کو اپنا بنا لوں گا۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔''

پھر بار بار استغفر اللہ پڑھنے لگے اور خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

سحر کھانا رکھ کر جانے ہی والی تھی کہ عبدالرحمٰن نے صرف گفتگو برائے گفتگو کی خاطر سحر کو مخاطب کرنا چاہا۔

"سحر، ذرا ٹھنڈا پانی تو میرے لیے ایک گلاس لا دینا۔"

سحر نے کہا، "ٹھیک ہے۔"

پانی لے کر سحر واپس آئی تو کہنے لگے، "سحر میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو گیا تھا۔ تم سچ مچ ٹھیک ہو نا؟"

"آپ پریشان نہ ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس ڈر سے کہ کہیں یہ شخص اپنی گفتگو کو طول ہی نہ دے دے، اس لیے وہ کمرے سے بہت تیزی سے نکل گئی اور پھر بے چارے عبدالرحمٰن بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

عبدالرحمٰن کی ماں کو اپنے بیٹے کے فون کا بے صبری سے انتظار تھا۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کا بیٹا تہذیب و آداب کے دائرے میں رہ کر ہی سسرال سے گھر واپس آنے کی خواہش ظاہر کرے گا۔ خاکساری، بزرگوں کی عزت کرنے کا جذبہ، صبر و استقلال، یہ سارے اوصاف ان میں موجود تھے۔ فریدہ بیگم نے واقعی بڑی محنت سے بیٹے کی تربیت کی تھی اور انہیں اس پر پورا بھروسہ تھا کہ مناسب موقع دیکھتے ہی ان کا بیٹا دلہن کو لے کر گھر واپس آ جائے گا۔

عبدالرحمٰن اپنے فرائض سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ماں کو کہیں باہر سے فون کیا اور بتایا کہ "اماں، سحر کی بہت طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

ماں اس جملے کو سن کر بس تڑپ اُٹھیں کہ چار دن کی بیاہی لڑکی کو یک بیک یہ کیا ہو گیا۔ "کیا ہوا بیٹا، کیسے ہو گیا۔ اب کیسی ہے؟"

نہ جانے منٹوں میں کتنے سوالات پوچھ ڈالے۔ عبدالرحمٰن تو بالکل بوکھلا ہی گئے۔ آخر کار انہوں نے بھی پیٹ کی تکلیف کا ہی بہانہ بنایا۔ ماں بدستور پریشانی میں رہیں اور کہتی رہیں۔

''بیٹا پوری طرح سے طبیعت درست ہو جائے تب سحر کو لانا۔ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سنا تم نے، اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔''

ماں سے بات کر کے عبدالرحمٰن کی پریشانی وقتی طور پر تو کچھ کم ہوئی، مگر سوچتے رہے کہ آخر کب تک یہ بہانہ چلے گا۔ سحر کو جلد از جلد میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا ورنہ میری ماں بہت پریشان ہو جائیں گی۔ ان کا اس دُنیا میں کون ہے سوائے میرے اور اگر میں ہی ان سے دُور چلا گیا تو وہ اس بڑھاپے میں کس کے سہارے جئیں گی۔ کیسے اپنے شب و روز کاٹیں گی۔

ایک دُنیا ہم لوگوں کے انتظار میں وہاں بیٹھی ہے۔ سارے لوگ وہاں کیا سوچیں گے، آخر بھلا میں کب تک اس قسم کا بہانہ بناتا رہوں گا۔ جس نے کبھی ماں سے جھوٹ نہیں بولا تھا، اسے سحر کے واسطے آج اتنا بڑا جھوٹ بولنا پڑا۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتے کہ 'شاید سحر کسی کو پسند کرتی ہے اور ماں نے زبردستی بیٹی کی شادی کر دی ہو...... شاید کوئی بے وفا سحر کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور سحر اسی کے غم میں اس طرح سے تڑپ رہی ہے'...... طرح طرح کے خیالات عبدالرحمٰن کو ستاتے رہے اور وہ دل ہی دل میں پریشان بھی ہوتے رہے۔

وہ سحر کے گھر میں موجود تھے ضرور، لیکن سحر ان سے کوسوں دُور تھی۔ بند کواڑ کے اندر بھی سحر کو عبدالرحمٰن اپنا نہیں بنا سکے۔ عورت کبھی کبھی مرد کے بہت قریب رہ کر بھی بہت دُور رہتی ہے۔

کبھی کبھی زندگی جیسی نظر آتی ہے، وہ در حقیقت ویسی ہوتی نہیں ہے۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے لیکن اندر سے حالات بہت ہی مختلف ہوتے ہیں اور پھر دونوں کو اسی انداز سے زندگی بسر کرنے کی عادت سی ہو جاتی ہے، لیکن یہاں تو بظاہر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا اور بہ باطن تو اُلٹ پلٹ تھا ہی، لیکن دروازے کے سامنے سے بے نیازانہ گزرنے والے کو شاید یہ خبر نہیں تھی کہ جو کمرے میں بیٹھا ہوا ہے، اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اسے در حقیقت یہ سوچنے کی فرصت کب تھی۔ سحر اپنے غم کو سینے سے لگائے ہوئے صبح سے شام تک پھرتی رہتی۔ شہزاد کے خیال نے اسے کچھ اس طرح سے پریشان رکھا تھا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

ہفتہ گزر گیا، مہینہ گزر گیا، عبدالرحمٰن ماں کو فون پر دلاسہ دیتے رہے۔ سحر کی خیریت سے آگاہ کرتے رہے...... ''اب سحر بہتر ہو رہی ہے امّاں''، اسی اُمید میں کہ سحر ان کے گھر جانے کو کسی نہ کسی دن تیار ہو جائے گی۔ ماں کو اب طرح طرح کی فکر ستانے لگی تھی، لیکن جب بھی فون پر بیٹے کی آواز سنتیں تو اطمینان کی سانس لیتیں۔ پھر بھی دل کے اندر جو ایک کھٹکا لگا تھا، سو لگا رہا۔ وہ ہر نماز کے بعد سحر کی صحت اور دونوں کی خوشیوں کے لیے دُعائیں کرتی رہیں۔ وہ اپنے بیٹے پر پورا یقین کرتی تھیں کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس میں کہیں بھی جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔

ماں باپ، عزیز و اقارب، گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عبدالرحمٰن بتولن بی کے چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں شادی ہو جانے کا اپنے ماتھے پر مہر لگا کر روز و شب گزار رہے تھے جیسے کوئی گھر بار چھوڑ کر صحرا نورد ہو جائے۔ ان کی اپنی زندگی ان کی اپنی نہ رہی۔ وہ اپنے اور سحر کے فاصلوں کے درمیان بس جیسے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ چہرے کی بے یقینی بڑی آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی جو بتولن بی اپنی کن انکھیوں سے دیکھ کر محسوس کر رہی تھیں، لیکن کیا کرتیں۔ ہر ممکن کوشش کرتی رہیں، سحر کو سمجھاتی رہیں۔ کبھی پیار سے، کبھی ڈانٹ کر، کبھی غصہ بھی آتا تو مصلحتاً داماد کے سامنے غصّے کو پی جاتیں اور جب وہ کہیں بازار یا مسجد میں ہوتے تو سحر پر برس پڑتیں۔

''کا ہوش میں آؤ گی کی نا؟ کا اونگوڑاا ایسے ہی کمرے میں پڑا رہے گا اور توں (تم) چوے پر چل چل کے سگرو (ہر طرف) ناچتی رہو گی۔''

عبدالرحمٰن بھی تو ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مذہب اور اخلاق سے آزاد ہو کر اپنی من مانی کرنے لگیں۔ انہیں خدا کا خوف ہر پل رہتا تھا۔ وہ بتولن بی کی بے بسی اور آنسوؤں کو دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ اپنے غم کو تو جھیل ہی رہے تھے لیکن بتولن بی کی پریشانی کو بھی محسوس کر کے وہ بتولن بی پر ترس کھانے لگے تھے اور آہستہ آہستہ وہ سحر کی محبت میں بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ سحر کا صرف گھر میں ہونا، اس کی چوڑیوں کی کھنک، اس کے آنچل کی جھلک اور کھانا پکاتے وقت اس کے ہاتھوں سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز ہی سے اپنا رشتہ جوڑ بیٹھے تھے اور دن بہ دن جیسے وہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے واپس پلٹنا ان کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ وہ خود کو سحر کے ساتھ مکمل طور پر جوڑ چکے تھے۔ شاید اسی کو یک طرفہ محبت کہتے ہیں، چونکہ عبدالرحمٰن کی زندگی میں پہلے سے نہ تو کسی کا تصور تھا، نہ خیال۔ اپنی ماں کے علاوہ صنف مخالف میں سحر ہی دوسری ہستی تھی جو ان کی زندگی کا حصّہ بنی۔ اس لیے انہوں نے اپنے تمام جذبات اس کے نام کر دیے۔

عبدالرحمٰن اپنے طور پر دل ہی دل میں ارادہ کر رہے تھے کہ آج سحر جب کھانا لے کر آئے گی تو وہ اس سے کھل کر بات کرنے کی کوشش کریں گے۔ آج وہ سحر سے سب کچھ پوچھیں گے جو وہ ہمیشہ سے پوچھنا چاہتے تھے کہ آخر اس نے اپنی اور ان کی زندگی کے بارے میں سوچا کیا ہے۔ گرچہ یہ کام ان کے لیے بہت ہی مشکل تھا لیکن پھر بھی یہ ان کا مصمم ارادہ تھا کہ اب وقت آچکا ہے کہ سحر سے بات کی جائے۔ آخر کب تک برداشت کریں۔

روز کی طرح سحر کمرے میں رات کا کھانا لے کر عبدالرحمٰن کے پاس آئی تو انہوں نے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں سحر!''

''کیسی باتیں؟''

''اماں ہم لوگوں کا بے صبری سے انتظار کر رہی ہیں۔ہم اور تم لکھنؤ کب چلیں گے؟''

سحر بولی،'' آپ خود ہی سوچیں نا۔ میں اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ لکھنؤ کیسے چلی جاؤں۔ ان کا یہاں کون ہے؟ بتایئے۔''

عبدالرحمٰن کو ایک زور کا دھکا لگا۔انہیں جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ پھر بھی جواب دینے کے لیے لب ملے اور جواب بھی بڑی ہی نرمی سے سحر کو مخاطب کر کے دیا۔

''دیکھو نا سحر، شادی سے پہلے تو یہ بات نہیں بتائی گئی تھی کہ مجھے اُٹھ اُٹھا کر اس شہر میں آ کر رہنا ہوگا۔ میرے ماں باپ وہاں تن تنہا ہیں، دکان ہے، میرا کتنا سارا کام میری غیر موجودگی کی وجہ سے وہاں رُکا ہوا ہے۔تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

سحر اس بات کا جواب تو یہی دینا چاہتی تھی کہ کام اگر وہاں کا بگڑ رہا ہے تو کس نے کہا ہے کہ یہاں رہیے، چلے جایئے اور اپنا کام کیجیے۔ وہ ایسا کچھ اپنی زبان سے اَدا تو نہیں کر سکی لیکن اس کا موڈ بدلنے لگا اور صرف یہی جواب دیا۔

''اتنی مشکل باتیں مجھ سے نہ کیا کریں۔ مجھ سے تو کبھی بھی کسی نے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ میری کیا خواہش ہے۔''

اور یہی جواب ان کے دل کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔انہیں اور زیادہ سوال و جواب کر کے بات کو بگاڑنی نہیں تھی۔اب ان کو سنبھل سنبھل کر بات کرنی تھی۔ عقل مندی بھی اسی میں تھی کہ خاموش رہیں اور یہی انہوں نے کیا بھی اور وہ کرتے بھی کیا؟

عبدالرحمٰن بیچ میں کئی بار اپنے ماں باپ سے ملنے لکھنؤ گئے۔ سحر کے بارے میں ماں باپ کو یہی بتایا

کہ وہ اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر لکھنؤ نہیں آنا چاہتی ہے۔ ماں نے بھی عبدالرحمٰن سے زیادہ سوالات نہیں کیے۔ انہیں تھوڑا تھوڑا اس بات کا خود بھی اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں بھی دُنیا کا تجربہ تھا لیکن بیٹے کے سامنے اپنے فکرو تردّد کا ذرا سا بھی اظہار نہیں کیا، بلکہ کہنے لگیں۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹا، وہ جہاں بھی رہنا چاہے وہیں رہے۔ میری تو بس یہی دُعا ہے کہ تم دونوں ہمیشہ خوش وخرم رہو جہاں بھی رہو۔ تم ذرا بھی فکر نہ کرنا بیٹا۔ ہم دونوں یہاں مزے میں ہیں۔''

انہیں کیا خبر تھی کہ عبدالرحمٰن کے شب وروز کیسے گزر رہے ہیں۔ تلخیِ زیست کو وہ کس طرح سے اپنے صبرواستقلال کا دامن پکڑ کر مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماں نے پھر کہا۔

''تم اپنی دکان کا کیا کرو گے بیٹا؟''

عبدالرحمٰن خاموش ہوگئے، لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے، ''سوچا جائے گا امّاں، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ کیا جائے گا۔''

عبدالرحمٰن کی زندگی کچھ عجیب ڈھب سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح سے ایک تماشا بن کر رہ جائیں گے۔ اب وہ اپنے بارے میں یہ سوچنے لگے تھے کہ میں جہاں جہاں اپنے پاؤں رکھتا ہوں وہاں پر زمین دھنستی چلی جاتی ہے۔ اس قدر جان نچھاور کرنے والی ماں سے دُور ہوگئے۔ کبھی ملنے کو بھی جاتے تو ماں کی آنکھوں کے خاموش سوالوں کا سامنا کرنا ان کے لیے ایک کڑی آزمائش بن کر رہ جاتا۔ بزنس بھی لکھنؤ میں کچھ وفادار ملازم سنبھالے ہوئے تھے۔ لیکن آخر کب تک؟ یہاں سحر کے گھر میں رات دن بلا کسی مقصد کے زندگی گزار رہے ہیں۔ بس مسجد جاتے اور آتے، روزہ نماز میں اپنا وقت گزارتے۔ سحر کے گھر کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے سنہری مسجد کہا جاتا تھا، وہیں زیادہ تر پنج وقتی نمازیں اَدا کرتے اور اپنی نمازوں میں وہ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دُعائیں مانگتے۔ آنسوؤں سے ان کا دامن تر بہ

تر ہو جاتا مگر کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔

اس بار جب وہ ماں سے ملنے گئے تھے تو ایک ارادے کے ساتھ۔ بیٹے کو دیکھ کر ماں کا دل بلیوں اُچھلنے لگا تھا۔ ان کے نصیب میں بہو کا ساتھ نہیں لکھا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ وہ خود ہی پٹنہ جا کر بہو سے مل لیں۔ زیرِلب عبدالرحمٰن سے تذکرہ بھی کیا لیکن انہوں نے مصلحتاً انہیں منع کر دیا تو وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی پٹنہ جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

''امّاں اگر میں اپنا بزنس پٹنہ میں منتقل کر لوں تو کیسا رہے گا؟''

یہ سن کر ماں کا دل اندر سے ڈُوبنے لگا لیکن ضبط کر کے جلدی سے بولیں۔

''ہاں ہاں ضرور۔ جب سحر کے پاس رہنا ہے تو بیٹا اور پہلے ہی یہ سوچنا چاہیے تھا۔''

ویسے عبدالرحمٰن خوب جانتے تھے کہ ان کی اماں کس دل سے یہ بات اپنی زبان سے اَدا کر رہی ہیں۔ دل کی باتیں نظروں سے کہیں عیاں نہ ہو جائیں، اس لیے وہ اپنی نظریں جھکائے ہی رہیں۔ لیکن عبدالرحمٰن کو پوری اجازت دے دی کہ وہ اپنا بزنس پٹنہ منتقل کر لیں۔ پھر آہستہ آہستہ عبدالرحمٰن کی دل جوئی کے لیے کہنے لگیں۔

''اپنا دل چھوٹا مت کرو بیٹا۔ آخر تمہیں کہیں دوسرے شہر میں نوکری ملتی تو کیا میری خاطر یہیں بیٹھے رہ جاتے نا؟ میں تو بس تم دونوں کی خوشی کے لیے دن رات دُعائیں کرتی ہوں۔ یہاں رہو یا وہاں رہو، جہاں رہو بس خوش رہو۔''

اور عبدالرحمٰن حالات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

عبدالرحمٰن نے آخر اپنا بزنس سبزی باغ پٹنہ میں ایک کرائے کی دکان لے کر اپنے ملازموں کی مدد سے جما لیا۔ سحر پر اس خبر کا ذرّہ برابر بھی اثر نہیں پڑا۔ دکان یہاں رہے، لکھنؤ میں رہے یا کہیں اور رہے، اسے کسی چیز سے مطلب نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن نے سحر کی محبت کے اسیر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اب یہیں رہنا ہے، اس

لیے مجھے اپنا بزنس بھی اسی شہر میں سیٹ کر لینا چاہیے اور یہی انہوں نے کیا بھی۔

کتابوں کے رسیا عبدالرحمٰن دکان سے نکلنے کے بعد خدا بخش لائبریری جاتے، وہاں سے کچھ کتابیں لاتے، کچھ واپس کرتے اور پھر گھر پر کتابوں کا خوب مطالعہ کرتے۔

ہاں بتولن بی البتہ بہت خوش، نہال و نہال تھیں۔ سحر کے اپنے سسرال نہ جانے کا غم تو انہیں اندر ہی اندر تھا ہی، لیکن جب انہیں یہ خطرہ ہونے لگا کہ کہیں عبدالرحمٰن غصّے میں آکر سحر کو چھوڑ کر نہ چلے جائیں تو وہ گھبرانے لگی تھیں۔ طرح طرح کے اندیشے انہیں ستانے لگے تھے۔ اس لیے وہ بے حد خوش تھیں کہ دلہا اب یہیں سے کام پر جائیں گے۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر دونوں کے لیے دُعائیں کرنے لگیں۔ ''بتاؤ ذرا، اسیا بَر اس کرم پھوٹی کو کہاں سے ملتا۔ ای تو ایسا بے منھ کا انسان ہے جس کا کوئی قدر ای مہارانی کے نظر میں ہے ہی نا۔ یا اللہ مدد...... یا اللہ مدد''۔ بولتی رہیں۔

انسان پر کیسا بھی پہاڑ ٹوٹے، ایک قیامت خیز حادثہ ہی کیوں نہ گزر جائے، یہ پل جو آہستہ آہستہ رینگتے ہیں، یہ روز و شب، ان چٹانوں کے بوجھ کو کسی نہ کسی طرح سے دھیرے دھیرے، ریزہ ریزہ سینے سے ہٹا ہی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ دُکھ درد دھندلے ہونے لگتے ہیں۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس بوجھ کو اُٹھانے کی جیسے عادت سے پڑ جاتی ہے۔ ناخوشگوار حالات جیسے زندگی کا ایک حصّہ بن کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کے اس حصّے کو الگ کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے انسان اسے کسی نہ کسی طرح سے بھوگ لیتا ہے۔

سحر کو بھی اپنے حالات پر جیسے صبر آ گیا تھا۔ وہ اس سچائی کی عادی ہو گئی تھی کہ شہزاد اب اس کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل چکا ہے۔ اب اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے زندگی نے ایک بار موقع دیا تھا جسے وہ اپنے ہی ہاتھوں گنوا چکی تھی۔ اب جو زندگی اس کے سامنے کھڑی ہے، اسی کو بتانی ہے...... چاہے رو کر یا ہنس کر۔ اب سحر کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ آنسو کی بھی ایک عجیب صفت ہوتی ہے۔ آنکھوں سے بہہ جائے تو دل کو

ہلکا بھی کر دیتا ہے اور اندر کی ساری کثافتوں اور آلائشوں کو بھی بہا لے جاتا ہے، لیکن اگر اسے بہنے سے جبراً روک دیا جائے تو وہ دل کو سخت پتھر بنا ڈالتا ہے۔ سحر کے اَن بہے آنسوؤں نے بھی اس کے سینے میں دل کو پتھر بنا دیا تھا۔ اسے اب نہ خود پہ رحم آتا نہ اپنی ماں پر اور نہ ہی عبدالرحمٰن پر، جنہوں نے سحر کی خوشنودی کی خاطر اپنی پہچان مٹا دی تھی اور سارے رشتوں کو عمر کی پچھلی منزل پہ ہی چھوڑ آئے تھے۔ ایک عجیب سی بے حسی سحر پر طاری ہو چکی تھی۔ عبدالرحمٰن کے تئیں اس کے دل میں کوئی جذبہ جاگتا ہی نہیں تھا۔ ان کی مشتاق نظریں اس پر مرکوز رہتیں، لیکن وہ ایک بار بھی اپنی پلکیں اُٹھا کر ان نظروں کی پذیرائی نہ کرتی۔ ماں کی فہمائش کو بھی نظر انداز کرتی رہتی۔

دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا۔ ماں بیٹی ہم لوگوں کے یہاں آتی جاتی رہیں۔ سحر جس طرح سے اپنے شوہر کی طرف سے بے نیاز تھی ویسی ہی بے نیاز رہی۔ میاں بظاہر کمرے میں کتاب میں منہمک رہتے مگر سحر کے قدموں کی آہٹ اور اس کی چوڑیوں کی کھنک کے منتظر بھی رہا کرتے اور کبھی کبھی بے مقصد بھی کتاب پر جھکے رہتے۔ سحر دن بھر میں کئی بار ان کے کمرے کے سامنے سے بے نیازانہ گزرتی، کبھی دالان میں پھول کی جھاڑو لگاتی ہوئی، کبھی آنگن کے دوسرے کونے سے پانی لاتی ہوئی عبدالرحمٰن کو نظر آتی، لیکن ان کے کمرے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اگر کبھی غلطی سے عبدالرحمٰن کی نظروں سے تصادم ہو جاتا تو ان کی آنکھوں کی ساری التجائیں اسے ان لمحوں میں نظر بھی آجاتیں...... لیکن وہ انہیں روندتی ہوئی آگے نکل جاتی۔ بتولن بی کے چھوٹے سے آنگن اور گھٹے گھٹے سے دالان میں سحر کا وجود ہی ان کے لیے بس کافی تھا۔ وہی ایک واحد روشنی تھی جس کے سہارے انہوں نے زندگی کو بسر کر لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا

میرے پندار میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

(اقبال عظیم)

گھر کے کام اور کھانا پکانے میں وہ قصداً مشغول رہتی جیسے گھر میں کوئی نوکرانی رکھی گئی ہو۔ بس وقت وقت سے کھانا ناشتہ بنا دیتی اور کمرے میں شوہر کے آگے کسی طرح سے رکھ آتی۔ جیسے ہی گھر کا سارا کام نپٹا لیتی، اس کے فوراً ہی بعد ہم لوگوں کے یہاں آ جاتی۔

ماں کو یہ سب دیکھ دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ بس ہر وقت کڑھتی رہتیں۔ وہ اسے اکثر ہم لوگوں کے گھر آ کر کسی کنارے والے کمرے میں لے جاتیں اور خوب ڈانٹتیں، اسے برا بھلا کہتیں۔

بہت دنوں سے یہ سب سنتے سنتے آخر کار اس نے ماں کو صاف صاف جواب دے دیا۔

''اماں سنو، گھر میں بلا کر تم نے انہیں بٹھایا ہے تو اب سے ناشتہ اور کھانا بھی تم ہی کمرے میں پہنچاؤ گی۔ میں کھانا پکا دوں گی، سمجھی۔''

بتولن بی اس کے اس تیور کو دیکھ کر ڈر گئیں اور چپ رہیں۔ یوں بھی اولاد جب جواب دینے لگتی ہے تو ماں باپ خاموش ہی ہو جاتے ہیں۔

''اماں میری جان چھوڑ دو۔ کاہے کو میرے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ تمرے چلتے ہم نے اپنے کو بہت سنبھالا...... خالی تمرے چلتے۔ ورنہ اب تک نہ جانے کاسے کا ہو جاتا، سمجھی۔ کہا نا کہ ہم اب بہت تھک گئے ہیں۔ میری جان کو چھوڑ دو امّاں۔ میرے ایک دم چھوڑ دو۔''

''کا ہو جاتا سحر۔ ذرا ٹھیک سے بتاؤ نے، کا ہو جاتا؟''۔ ماں نے پوچھا۔

سحر نے جواب دیا، ''کاہے میرا منھ کھلوا رہی ہو۔ تم سن نہ سکو گی۔''

دونوں ماں بیٹی کی آواز سن کر امّی ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے آ گئیں۔

''کیا اتنا بحثا بحثی ہو رہی ہے۔ کیا ہے سحر، امّاں کو کیا کہہ رہی ہو؟''

امّی کو دیکھتے ہی سحر خاموش ہو گئی۔ وہ امّی کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ امّی کی موجودگی کی وجہ سے بتولن بی کو

تقویت ملی اور انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔

''آیئے صاحب آیئے۔ جرا اس کا (مذکر مونث کا خیال نہیں تھا انہیں) بات تو سنیئے''۔ بہت ریگھا کر بولنے لگیں، ''ان کو اپنے میاں پسند نا ہیں۔ ارے ای کا کھوجتی تھیں۔ صاحب ان کو اور کا ملتا۔ ای تو بہت مل گیا۔ خالی گوری چمڑی پر کچھ نا ملے ہے۔ سو جان جاؤ۔ او بچہ اپنا گھر بار چھوڑ کے ای جو میری اندھیری جھونپڑی میں رات دن پڑا رہے ہے...... کس کے لیے...... بولیے نا صاحب کس کے لیے۔ ایہی پگلی کے لیے نا! اور ای ہیں کہ او کو (اس کو) مڑ کے ایک نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتی ہے صاحب۔ اب بتایئے اس کا کا جواب ہے؟ او نگوڑا مسکرا مسکرا کے بات کرے ہے اور ای اینٹھی اینٹھی رہے ہے۔ ہائے صاحب ایسا فرشتہ ہے کی، ہم آپ کو کا بتاویں۔ دیکھو سحر، اس کو تم بدھومت سمجھیو۔ صاحب او شریف ہے شریف اور ای کم بختی کی ماری سے او کو عشق ہو گیا ہے، اور کچھ نا۔ کا ہے کی بس ای جو اِدھر سے اُدھر چھم سے آتی ہیں اور چھم سے جاتی ہیں اور ہی دیکھ کے بس نگوڑا میرے گھر میں ٹکا ہوا ہے۔ ای تو کمرے میں کھانا بھی ڈھنگ سے نا لے جاتی ہے۔ ارے اپنی جندگی (زندگی) کا ستیاناس کا ہے کو کر رہی ہو بابو۔''

امّی نے سحر کو بہت سمجھایا۔ ان کے سامنے تو سر جھکا کر سب کچھ سنتی رہی۔ وہ امّی کے سامنے کبھی بھی کوئی سوال جواب نہیں کرتی تھی۔

عبدالرحمٰن جب اپنی امّاں سے ملنے کو لکھنؤ جاتے تو میں بتولن بی کے یہاں سحر سے ملنے کو چلی جاتی۔ مجھے دیکھ کر ماں بیٹی دونوں ہی بہت خوش ہو جاتیں۔ میں نے وہاں جا کر اسے بارہا سمجھایا کہ ''سحر اب یہی تمہاری زندگی ہے اور اسی زندگی کو تمہیں قبول کرنا ہوگا۔ اسی میں جینا سیکھو اور تم اب کیا کر سکتی ہو۔''

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگتی اور کہتی، ''میں سمجھتی تھی کہ کم از کم تم مجھے اور میری حالت کو بخوبی سمجھتی ہو لیکن واقعی کیا تم بھی مجھے نہیں سمجھتیں؟ اور اب تم بھی امّاں ہی کی طرح بولنے لگی ہو۔''

''نہیں سحر ایسی بات نہیں ہے''۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، ''میں تمہارے دُکھ کو اچھی طرح سے سمجھتی ہوں۔''

مجھ سے لپٹ کر وہ رونے لگی۔ شہزاد کا نام تو اب نہیں لیتی تھی لیکن کہنے لگی، ''ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میری رُوح کو چھلنی چھلنی کر دیا ہے۔ میں اپنی سوچ کو کس طرح بدل دوں۔ لوگ کس طرح اپنی سوچوں کو بدل دیتے ہیں''۔ آخر کار اپنے دل کی بات وہ کہہ گئی، ''میں کس طرح اس چہرے کو بھلا دوں جو میرے لیے سب کچھ تھا۔ کوئی مجھے ذرا سمجھا دے۔''

میں جس حد تک سمجھا سکتی تھی اسے سمجھاتی رہی، ساتھ ساتھ اسے بولنے پر بھی مجبور کر دیتی کہ شاید اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور وہ اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدل دے۔

''تم اگر چاند کو پانا چاہو گی تو کیا پا سکتی ہو؟ نہیں نا؟ تو پھر تم یہی سوچو کہ وہ تمہاری دسترس سے بہت دُور تھا۔ وہ بس ایک واقعہ بن کر تمہاری زندگی میں آیا اور چلا گیا۔ بس اور کچھ بھی نہیں۔ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جو بازار میں بکتی ہیں، طرح طرح کی حسین سے حسین چیز جسے تم اپنے گھر میں لانا چاہتی ہو، لیکن تم اسے نہیں خرید سکتیں، وہ چیز بہت مہنگی ہے۔ بس یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ تمہیں یہ قبول کرنا ہو گا سحر کہ وہ تمہارا ماضی تھا اور یہ تمہارا حال ہے۔ اور تمہیں حال کے ساتھ جینا ہے۔ شہزاد کو اپنی زندگی کا ایک گمشدہ باب سمجھ کر بھلا دو۔ اب وہ نامراد کسی جوگا نہیں رہا۔ اب تو شہر میں بھی اس کا نام ونشان نہیں ملتا۔ ماں باپ بھی گھر بیچ باچ کر جانے کہاں چلے گئے۔ کیوں اس کے لیے اپنی زندگی کو برباد کر رہی ہو۔ ساتھ ہی عبدالرحمٰن کی شرافت کو بھی آزما رہی ہو۔''

سحر بلک بلک کر رو پڑی۔

''یہی برچھی تو کلیجے میں ترازو ہو گئی کہ میری خاطر وہ بے نام ونشاں، اپنے وجود کے اندھیرے میں کھو گیا۔ کاش اس شام میں نے اس کی بات مان لی ہوتی۔''

میں نے سحر کو اپنے سینے سے لگا کر جی بھر کر رونے دیا تا کہ اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو جائے۔ اس کے سر کو تھپکتے ہوئے میں نے اس کے دل پر جمی بے حسی کی برف کو پگھلانے کی ایک آخری کوشش کی اور دھیرے سے اسے کہا۔

''ہاں سحر۔ شہزاد تمہاری خاطر برباد ہوا۔ لیکن اب گزرے پل کو واپس لوٹایا نہیں جا سکتا۔ کیا تم چاہتی ہو عبدالرحمٰن بھی اسی طرح قربان ہو جائے؟''

سحر چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں مجھے بے چینی نظر آئی لیکن دوسرے ہی پل پھر سے بے حسی کی دبیز چادر پھیل چکی تھی۔

عبدالرحمٰن کے لیے بتولن بی کے تنگ و تاریک گھر میں رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ان کی شرافت، رشتوں کے احترام کا جذبہ اور سحر کی محبت اس قدر حاوی تھی کہ کبھی زبان سے اُف تک نہیں کیا اور ایسا لگا کہ ساری عمر وہ ان ہی حالات میں زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ وہ سحر کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے دل میں ہمیشہ یہی سوچا کہ سحر میری ہے۔ میری نہ ہو کر بھی میری ہے۔

سفید کُرتے پاجامے میں ملبوس، ہاتھ میں کتاب، کبھی تسبیح لیے آٹھوں پہر سحر کا انتظار کرتے۔ کبھی سحر ہم لوگوں کے یہاں آجاتی تو وہ بے چینی میں گھر سے باہر نکل کر گلی میں ٹہلنے لگتے اور سحر کے واپس آنے کا انتظار کرتے رہتے۔ جیسے ہی اس کو آتے ہوئے دیکھتے یا اس کا دوپٹہ گلی کے موڑ سے جھلک جاتا تو وہ جلدی سے گھر کے اندر داخل ہو جاتے۔

سحر اکثر یہ سوچتی کہ یہ شخص میری جان مرتے دم تک نہیں چھوڑے گا۔ اس نے تو ہر ممکن اپنی بے نیازی کو ظاہر کیا لیکن ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ سحر کو چھوڑ کر کہیں جائیں۔ وہ ویسے تصوّر سے بھی کانپ جاتے تھے۔

ان کی نظروں کی ٹھنڈک تو بس سحر ہی تھی جس کی زبان سے اَدا کی ہوئی ہر جلی کٹی بات پھولوں کی مانند ان پر برستی تھی۔ سحر کی ان کی طرف سے بے نیازی اور ہمیشہ یک بیک گھر سے بگڑ کر نکل جانا، ان کے لیے زندگی کا ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ جب ماں کو یہ کہہ جاتی ''روٹی پکا دیا ہے ذرا کمرے میں دے آنا'' اور بغیر کسی جواب کے انتظار کے گھر سے نکل جاتی تو عبدالرحمٰن کھڑکی کی اوٹ سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے اور مسکراتے۔ جب بتولن بی بڑے پیار سے کھانا لے کر کمرے میں آتیں تو خوشی خوشی سحر کو تصور میں لا کر اس کے ہاتھوں کی پکائی ہوئی روٹیاں مزے لے لے کر کھاتے اور اللہ کا شکر اَدا کرتے۔ مطالعے کے دوران، کبھی کبھی کوئی شعر ان کی اس دُکھی زندگی سے تال میل کھا جاتا تو وہ بالکل افسردہ ہو جاتے۔ پھر نماز کا وقت ہو جاتا تو وضو کر کے خدا کی بارگاہ میں جھک کر اپنے دلی سکون کی دُعائیں مانگتے۔

عبدالرحمٰن جو دسہرا کے دولہا بن کر بتولن بی کے آنگن میں اُترے، آج تک ویسے ہی دسہرا کے دولہا بنے رہے۔ دل کھول کر کسی سے باتیں نہ کیں۔ کبھی کبھی دالان اور آنگن میں نکل کر ساس سے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کرتے۔ جب بتولن بی کی آنکھوں میں اشک تیرتے ہوئے نظر آتے تو خود ہی کہنے لگتے۔

''آپ اس قدر کیوں پریشان ہوتی ہیں امّاں، سحر ٹھیک ہو جائے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور جواب میں بتولن بی کچھ بھی نہ کہہ پاتیں۔ اپنی ساڑی کے آنچل سے آنکھیں خشک کرنے لگتیں اور خاموش ہو جاتیں۔ سحر کی ایک جھلک ان کے پہاڑ جیسے دن کے لیے کافی ہوتی۔ خاموشی سے اپنے دل میں یہی کہتے رہتے:

''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا ہوں سحر۔ سحر، تم میری ہو اور میری رہو گی۔ تمہاری ایک التفات بھری نظر پر میں اپنی جان لٹا سکتا ہوں۔ کبھی تو تم میری طرف دیکھ کر میری محبت کو سمجھو۔ محبت تو سحر، پتھر کو بھی موم بنا دیتی ہے۔ میری محبت ضرور تم کو ایک دن موم بنا دے گی۔ تم ایسی نازک، نازنین سے لڑکی اتنی کٹھور کیسے ہو سکتی ہو۔

تم جس طرح سے میرے لیے کڑھی چاول اور آلو کی مسالے دار بھجیا پکاتی ہو ویسی کوئی چیز میں نے زندگی میں کبھی چکھی بھی نہیں تھی۔ آخر وہ اس قدر ذائقے دار کیسے بنتی ہے۔ ضرور تمہاری محبت اس میں گھلی ہوئی ہے۔ تب ہی تو تمہارے ہاتھ کا کھانا مجھے اس قدر پسند ہے۔ واقعی مجھے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ تم خاموشی سے مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہیں محبت کو ظاہر کرنے کا ہنر ہی نہیں آتا۔ تم میرے پاس آکر تو دیکھو، آؤ اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دو۔ اگر ماضی میں تم سے کوئی بہت بڑی غلطی بھی ہوئی ہے تو میں اپنے دل کی گہرائی سے تمہیں معاف کردوں گا۔"

بتولن بی نے کیسی کیسی دُعائیں، فاتحہ، تعویذ گنڈہ کروایا مگر سحر، میاں کا نام سنتے ہی خاموش ہوجاتی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کو کوئی گھن کھائے جارہا ہے۔ بتولن بی سمجھاتی بھی جاتیں اور ساتھ ساتھ دُعائیں بھی کرتی جاتیں۔

"ہاں ہاں اونگوڑا پھٹہ باج نہیں ہے کہ ان کو پھلم (فلم) کی کہانی سنا تا رہے...... اور کچھو (کچھ بھی) ان کو سناوے تو کیسے۔ ان کے پاؤں میں تو گھِرنی بندھی ہے۔ کبھی دیکھو تو ایک گھڑی ہیاں (یہاں) کبھی اونہاں (وہاں)۔"

سحر کو امّی کی موجودگی میں ماں کی یہ سب باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ وہ پریشان اور بے چین ہوکر کچھ زیرلب بُد بُداتی تو وہ بھی بتولن بی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔

"ہاں تو جرا (ذرا) بُد بُداؤ مت۔ ای سب لچھن تمرا بہت بُرا ہے۔ کہہ رہے ہیں سحر، ذرا دھیان سے رہو۔ دیکھو دُنیا بڑی کھراب (خراب) ہے۔ ایک کان دو کان، تیسرا کان بیابان۔ سارا محلّہ جب تھوتھو کرے گا تب ای سمجھیں گی۔"

بتولن بی پورے طیش میں تھیں۔ انہیں رہ رہ کر اپنے نیک، شریف اور بے زبان داماد پر رحم آتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں سحر ان کی شرافت اور وضع داری کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔ کسی اور کی کرنی کا پھل بے چارے کو بھگتنا

پڑ رہا تھا۔ وہ امّی سے مخاطب ہو کر پھر کہنے لگیں۔

''ارے صاحب، ان کا نکھرا (نخرہ) آپ کا جانیں۔ سنیے۔ اس لڑکی کا نکاح جو روز ہوا، اس کے بعد میرے پاس آئیں اور رو رو کے بولیں کی اے (مہندی) کی لالی میرے نا اچھی لگے ہے۔ روئی اور اسپرٹ لا کے ناخن کی لالی چھڑواوے لگی۔ بتایئے صاحب، مہندی کی لالی جو ایک بار چڑھ گئی، او (وہ) لالی اب کہاں سے اُترہیے (اُترے گی)۔''

اس جملے کو اَدا کرتے ہوئے بتولن بی مجھے ایک فلسفی سے کم نہیں لگیں۔ امّی ان کو آہستہ آہستہ ہمیشہ ہی دلاسہ دیتی رہتیں۔

''بتولن بی آپ کیوں اس قدر پریشان ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اب وہ رونے لگیں اور رو رو کر بولیں، ''ای عمر میں راتوں کی نیند حرام کر کے پالا ہے صاحب!''

کہیں سے بھی ان کو پتہ چلتا کہ فلاں جگہ پر کسی پیر بزرگ کا مزار ہے، کوئی جانی مانی درگاہ ہے تو بس، وہ رکشہ یا آٹو رکشہ لے کر مزار پر پہنچ جاتیں۔ پٹنہ (بہار) میں بہت ساری درگاہیں اور قدیم زیارت گاہیں آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ اس صوبے میں مسلمانوں نے اوّل اوّل قدم جمائے۔ ''تاریخ فتشتہ'' کے مطابق، حضرت نوحؑ کی نسل میں فیروز رائے نام کے شخص نے اس کو آباد کیا اور اس نے فلاح و بہبود کے بہت سارے کام کیے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھّم اُتّر جانب جہاں اب خانقاہ ہے وہاں پر راجہ منیر کے محلات تھے۔ بڑی درگاہ کے پچھّم جو تالاب ہے وہ بہت قدیم ہے اور اس کے چاروں طرف اُونچی اُونچی سیڑھیاں ہیں۔ مخدوم یحییٰ منیریؒ کا مزار ہونے کے سبب اس جگہ کو بڑی درگاہ کہتے ہیں۔ بڑی درگاہ سے اُتر پچھّم دوسرا بلند احاطہ ہے جس کے بیچ میں مخدوم دولتؒ کا مقبرہ ہے۔ یہ چھوٹی درگاہ کہلاتی ہے۔

بتولن بی پٹنہ اور اس کے آس پاس کی ساری درگاہوں اور مزاروں کی زیارت کر آتیں۔ رو رو کر

دُعائیں مانگتیں اور ساتھ ساتھ منتوں اور مرادوں کے سارے لوازمات کو پورا کرتیں۔ گھر آکر سحر کو پھونکتیں، مٹھائی کھلاتیں، داماد کو پھونکا ہوا پانی بوتل میں لا کر دیتیں۔

''صبح اور شام دو بار پیہو (پیو گے) بیٹا!''

بار بار آہیں بھرتیں اور اچھے دنوں کی اُمید میں دن بھر کی تھکاوٹ کو سمیٹے ہوئے اپنے کھٹولے پر سو جاتیں۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ بتولن بی کسی بزرگ کے مزار یا کسی درگاہ سے واپس آئی تھیں، بہت ہی دھیمی دھیمی سی، تھکی تھکی سی۔ آتے ہی یوں گویا ہوئیں:

''میاں، ذرا پانی پلاؤ جی۔ جان بدن میں سکت (طاقت) نا ہے بابو۔ ارے بے مرے جنت کے کو (کس کو) ملی ہے۔''

ہم نے پوچھا، ''کیا ہوا بتولن بی؟''

بتولن بی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں، ''ارے کا بتاویں بابو۔ پٹنہ ٹیشن (اسٹیشن) کے پاس توری (تمہاری) سکھی کے یہاں گئے تھے جی۔ اونا ہیں، جکیہ (ذکیہ، میری دوست) ہواں جرا (وہاں ذرا) سانس لیوے (لینے) لگیں۔ پھر سوچا کی، ادھریئے سے جرا پیر بجرگ (بزرگ) کے مجار (مزار) پر پھاتہہ (فاتحہ) پڑھنے کو جائیں۔ چلو ان کے گھر سے نکلے تو ایک ٹھو چھونڑا (چھوکرا) ملا۔ او کے سے پوچھا کی، ارے بابو او بڑے بجرگ کا مجار کدھر ہے تو بولا کی بس یہی ناک کے سودھے (سیدھے)۔ اور او ہی سودھے سودھے جاتے جاتے بائیں طرف مڑ یہو (مڑوگی)، تو جیسے ہی مڑ یہو تو دیکھیہو (دیکھوگی) کہ ایک ٹھو بڑا ایسا گول ایسا چیز ہے، او ہی بڑکا ایسا جو گول ایسا گھر ہے، او ہی مجار ہے۔ جیسے جیسے چھونڑا بولا تھا، ویسے ویسے مڑے۔ مجار تو ملا مگر او تو بہت بڑا مجار تھا بابو۔ تھکے ہارے او ہیں پر بیٹھ گیئے۔ تو او ہی مجار کے سامنے کھڑے ہو کر پھاتحہ پڑھا اور سحر کے دماگ (دماغ) کے نا پھرے کا دُعا مانگا۔ کہا کہ...... کہ اے مخدوم صاحب! ہم تو چھوٹی سی چادر لے کے آئے

تھے، ہم کو معاف کر دیجئے گا مخدوم صاحب۔ ای ہے آپ کا چادر اور ای ہے آپ کا سیرنی (شیرنی)۔ ای مجار تو آپ کا بہت ہی بڑا ہے۔ ہم تو آپ کا چھوٹی چادر لے کے آئے تھے۔ پھر اوہیں پر بہت دیر بیٹھے رہے اور سحر کی خوشی کے لیے دُعا مانگتے رہے۔ مرتا کا نہ کرتا۔ اوہاں سے اُٹھے، ہائے جانو ہو بیٹی، مڑ کے آخری بار مجار کو دیکھا تو کا دیکھے ہیں کی اوہی چھونڑا بیٹھا بیٹھا مٹھائی کھا رہا ہے۔ ہم بولے بیٹی کی...... جا تو جانے اور مخدوم صاحب جانیں۔"

یہ سب بتولن بی کی زبان سے سن کر سب لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگے۔ اس لڑکے نے انہیں پٹنہ کے مشہور گول گھر کا پتہ بتا دیا تھا جو کہ کم از کم چالیس گز چوڑا اور چالیس گز لمبا ہے جس میں سرکار اناج وغیرہ رکھتی ہے۔ کسی نے پکار کر کہا۔

"ہائے بتولن بی آپ نے یہ کیا کیا؟ وہ تو گول گھر ہے۔ اس میں تو سرکار اناج وغیرہ رکھتی ہے۔ مزار تو اس گول گھر کے پیچھے کہیں ہے۔"

کہنے لگیں، "ہم کا جانیں بیٹی۔ اوہی چھونڑے، منہ جھونسا، کل موہنا جو بولا، ہم اوہی کیا۔ جائے دو میاں، چھانے گا گلی گلی کی خاک (خاک) جیسا میرا دیا ہوا سرنی (شیرنی) ڈھکار رہا تھا، او کے حلک (حلق) میں مچھلی کا کانٹا اڑے گا۔"

سحر نے بھی ماں سے بہت سارے محاورے سیکھ لیے تھے۔ پہلے تو خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی، پھر زیب لب بولی، "اماں تو رائی سے پہاڑ اور تل سے تاڑ بنا دیں ہیں۔"

"ہائے کا بولو ہو سحر، ہم کا جھوٹ بولیں ہیں؟" پھر توبہ توبہ کرنے لگیں اور دونوں گالوں پر طمانچے مارنے لگیں۔

وہ جب اپنے پورے جوش میں آ جاتیں تو پھر کہاں رُکتیں۔ ہم لوگوں نے اس وقت ان کو ان کے

حال پر چھوڑ دیا، اس لیے کہ وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ خاموش ہوگئیں اور وہیں تخت پر کھانا کھا کر سوگئیں۔

بتولن بی کے ان کوسنوں کے بعد میں نے کسی سے بھی ایسے کلاسیکل کوسنے نہیں سنے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب کوسنا دینے والوں کا دور ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے کہ پڑھے لکھے حلقے کی مستورات خادماؤں کی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ بیگمات اور ان کی خادمائیں اب کہاں نظر آتی ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت اب گئے وقتوں کی چیز سمجھیے۔ مہذب طبقہ ہو یا غیر مہذب، گالیاں اور کوسنے تو دونوں ہی طبقے میں رائج رہی ہیں، صرف معیار کا فرق ہوتا ہے۔

بتولن بی اگر غصّے میں آگئیں تو ان کا کلام ہی کوسنے سے شروع ہوتا اور کوسنے پر جا کر ہی ختم ہوتا۔ ویسے بتولن بی کے کوسنے بڑے ہی ہلکے پھلکے ہوتے تھے مگر لب ولہجہ ایسا ہوتا اور اتنی شدّت سے باتیں کرتیں، زور دے کر کہ وہ لہجہ دوسرے لہجوں سے جداگانہ ہوتا۔ درحقیقت وہ ایک بہت ہی معصوم اور فرشتہ صفت انسان تھیں جو ہمیشہ ہی زمانے کی ستم ظریفی کا شکار رہیں اور اب بہت زیادہ تھک چکی تھیں، لیکن پھر بھی ان کی باتوں سے شکست خوردگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

چاندنی رات میں ایک دن ہم سب لوگ آنگن میں بیٹھے تھے۔ کسی نے پوچھا، ''آپ جانتی ہیں بتولن بی، یہ ستارہ آسمان میں کیسے ٹوٹ جاتا ہے؟''

''ہائے ناجانو ہو بابو، پھٹکارا ہوا سیطان (شیطان) جو بڑا لپک لپک کے اللہ میاں کے پاس جا ہے تو ہوئیں (وہیں) سے اللہ میاں ایسا اس کو مارے ہیں کی بلبلاتا ہوا ہوں (وہاں) سے بھاگے ہے اور اوہی ٹوٹ پھوٹ کے جمین (زمین) پر گر جا ہے۔ اور کا۔ کا ہم ای سب نا جانے ہیں کا؟ ارے ہم سب جانیں ہیں۔ اور پوچھو...... اور کا پوچھیو۔''

وہ بیٹھی بیٹھی کبھی ایسی کہانیاں سناتیں کہ ہم سبھی سنتے ہی رہ جاتے۔ اپنے پُر جوش لہجے میں اور پورے سراپے کو جنبش دے دے کر اس طرح سے سناتیں کہ طبیعت واقعی ہشاش بشاش ہو جاتی۔ اس طرح بے ساختہ اور برجستہ باتیں کرنے والے تو اب بہت کم نظر آتے ہیں۔ اب تو اپنے نفع نقصان کا خیال کر کے مصنوعی باتیں کرنے والے ہی ملتے ہیں۔ بتولن بی کو نہ تو نفع کا لالچ تھا اور نہ ہی نقصان کا خوف۔ ویسے دل سے نکلی ہوئی باتیں تو اپنا راستہ خود ہی ڈھونڈ لیتی ہیں جیسے پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے یعنی کسی کے دل کا راستہ ملا تو ادھر ہی اُتر گیا ورنہ فضاؤں میں بھاپ بن کر گم ہو جاتا ہے۔

ایک کہانی، یعنی سچی کہانی، اپنی زندگی کی کہانی بتولن بی نے ایسے سنائی کہ اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
''سحر پیدا نا ہوئی تھی، بیٹی اور میرے...... میرے تو بس ایکئے (ایک ہی) کھکھن (لگن) تھا کی ہائے کوئی عود جلاوے والا گھر میں پیدا ہو جائے۔ بہت دوا کیا دارو کیا، تو یج (تعویذ) گندھوایا، کانا کیا، بڑے بڑے پیر کے اوہاں (وہاں) بھی گئے، دعا کیا، پھاتحہ (فاتحہ) پڑھا مگر ای بجڑی تکدیر (تقدیر) کو کچھ نہ ملا بابو۔ بڑی روئے دھوئے۔ سرکار سمجھاتے رہے...... ارے کاہے کو گھری پہر ٹسوا بہاؤ ہو، سمجھ لو اللہ کو منظور نہیں ہے۔ ای سن کے بیٹی ہم چپ ہو جاتے تھے۔ پھر ایک روز ہم ہی بولے کی 'اجی سرکار تم دوسری شادی کر لو۔ شاید تمرے نصیب میں اولاد ہو'۔ سرکار بہتر وئے اور بولے 'نہیں ایسا مت کہو'۔ مگر میرے بولتے بولتے ایک روز سرکار کہنے لگے...... 'ٹھیک ہے۔ اگر تم کہو تو کر دو میری دوسری شادی'۔۔ میرے نظر میں ایک ٹھو (ایک کوئی) تھیں۔ انہیں سے منسوب لگایا۔ ہم ہی ڈالا تیار کیا۔ تیل لایا، چینی لایا اور نار ابدھی سب کیا بابو۔ میری سوتن، بٹیا بن کے میرے گھر آ گئی۔ جب او میرے گھر دلہن بن کے آئی تو میرا جی بہت ہی بگڑے لگا، مگر ہم سرکار سے کچھ نہ بولے۔ بس آنگن او سارا کرتے رہے۔ شام سے رات ہوئی اور جب سرکار میری سوتن کے ساتھ کمرے میں جا کے اندر چھٹکلی لگا کے بند ہوئے تو میرا دماگ (دماغ) پھٹے لگا۔

بیٹی ایک تو کریلا تتیا، اس پر چڑھا نیم۔ جانو ہو کا کیا ہم نے؟''

میں نے پوچھا، ''کیا کیا بتولن بی؟''

''دیہات میں دو کمرے کے بیچ میں دیوار اُوپر سے کھلی رہے ہے۔ جاڑا کا زمانہ تھا، ہم تو بابو نا دیکھا آؤ اور نا دیکھا تاؤ، دہکتی ہوئی بورسی (انگیٹھی) اُٹھا کر سرکار اور سوتن کے بستر پر پھیک دیا۔ دونوں بڑی زور سے چیخے، بڑا ہنگامہ ہوا۔ پھر ہم جا کے سرکار سے بولے کہ ای تو کبھی نہ ہوگا۔ چلو سرکار میرے کمرے میں چلو۔ سرکار بولے لگے کہ ہائے بیگم تم ہی نے میرے شادی کرانا چاہتی تھی۔''

میں یہ سب سن کر بالکل سکتے میں تھی اور بتولن بی کی ہمت پر خاموشی سے داد دے رہی تھی۔

میں نے پوچھا، ''پھر کیا ہوا بتولن بی؟''

بتولن بی بولیں، ''پھر کا ہوگا، سرکار آگئے میرے پاس۔ سوتن گئی اپنے گھر۔ اللہ تعالیٰ کا میرے اوپر ترس آوے لگا بابو کہ اوہی (اسی) مہینے سے جی متلاوے لگا، پھر سحر پیدا ہوئیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ ای تو ہوا میرے ساتھ۔''

اب تو بس بتولن کے دل و دماغ میں ہر وقت ایک ہی بات چکر کاٹ رہی تھی کہ کیسے وہ سحر کے دل و دماغ کو درست کریں۔ سحر کو عبدالرحمٰن سے رغبت دلائیں۔ کوئی یک بیک ہی اللہ کی شان نظر آجائے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے دل و جگر سے ایک ہو جائیں۔ کبھی کبھی وہ سحر کی خوشامد کرنے لگتیں، اس کی خوب تعریف کرتیں اور کبھی گڑگڑانے لگتیں، لیکن سحر کی خاموشی تو بالکل کسی پتھر کے جیسی بن چکی تھی جو ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔

داماد سے کبھی چھپے چھپے انداز میں کہتیں، ''ارے بڑی ضدی ہے بابو۔ چھٹ پن سے ہی بڑی ضدی ہے''۔ پھر بتولن بی خود ہی کہتیں، ''ٹھیک ہو جائے گی بابو۔''

عبدالرحمٰن تو بتولن بی سے کھل کر بات کر ہی چکے تھے لیکن پھر بھی دلاسہ دیتے، ''آپ مت گھبرائیں امّاں، آپ اطمینان سے رہیے نا!''

یہ سن کر بتولن بی کو تو وقتی طور پر اطمینان ہو جاتا لیکن دل کے اندر بیٹھے ہوئے ڈر کو ایک بوجھ کی طرح ڈھوتی ہوئی سودا سلف لاتی رہیں۔

ہمارے معاشرے میں اولاد کی ازدواجی زندگی کے سارے فیصلے تو بزرگوں کے ہی ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ازدواجی زندگی پر تو ماں باپ جیسے چھا جاتے ہیں۔ ان کا دُکھ ذرا بڑھ چڑھ کر ہی ماں باپ کا دُکھ بن جاتا ہے اور پھر وہ بچوں کے دُکھ درد کو سینے میں لیے ہوئے اُٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے رات اور دن کوشاں رہتے ہیں۔

ان دنوں بتولن بی کے پاس جو بھی پیسہ آتا، وہ اسے جمع کر کے رکھتیں کہ ''ہیاں ہواں جائے میں کرائے میں کام آوے گا''۔ سحر ان سے کبھی پیسہ نہیں مانگتی تو خود بہ خود اپنے آپ ہی بولنا شروع ہو جاتیں۔

''ارے، ہم کام ہی کے لیے نا تھوڑا سا پیسہ الگ کر کے رکھے ہیں اور کا...... ہم کا قبر میں لے کے جائیں گے۔ نانے۔ ارے کا کفن میں جیب ہوئے ہے۔ تھوڑا سا پیسہ الگ کر کے یہی لیے رکھا ہے کہ ای درگاہ، او درگاہ جانا ہے نا...... تو کرایہ کون دے گا؟ مخدوم صاحب نانے؟ سن رہی ہو سحر ایک روز تورے میرے ساتھ چلے پڑے گا۔ منیر کی درگاہ پر۔ ارے بھائی کچھ ہاں ہوں بولوگی، کی منھ میں گلگلا لے کے بیٹھی رہوگی۔''

سحر کچھ دیر خاموش رہی، پھر اُکتائے ہوئے انداز میں بولی، ''سن تو رہے ہیں امّاں کب جاؤ گی اور کاہے کو جاؤ گی؟''

''تورے ای سب سمجھ میں نا آوے گا بٹی۔ توں آج کل کے پھیسن (فیشن) کی ہو۔ تورے کا پتہ

کی، ای بزرگ کا اوران کا آستانہ اورای منت کا ہوئے ہے۔''

پھر بہت ہی آہستہ آہستہ، سمجھانے والے انداز میں بولنے لگتیں، ''دیکھو سحر، ہم جو کہیں اوہی کرو۔ دس سوال پوچھے کا درکارنا ہے۔ دیکھوگی کی کیسا اللہ پانسا پلٹ دیتا ہے۔''

سحر نہایت تلخی سے مسکرائی اور بولی، ''اماں اب پانسا کیا پلٹے گا۔ میری زندگی میں اب کیا ہوسکتا ہے۔ تم ہی بتاؤ نا؟''

بتولن بی ایک دم خاموش ہوگئیں۔ پھر آہستہ آہستہ بول کر رونے لگیں، ''ہائے ہائے میرا کرم ایسی اولاد جو مائے کا بات نہ مانے۔ ہائے ای کا ہے کو پیدا ہوئی تھی۔''

سحر کو ان پر ترس آنے لگا، ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بھائی جہاں کہوگی ہواں چلے جائیں گے۔ کب جانا ہے، کہاں جانا ہے؟''

''پھر اوہی بات۔ کُتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ ارے پوچھو مت، بس کل صبح کو تیار رہوگی، ٹھیک ہے۔ جہاں کہیں توں (تم) کو جائے کو، میرے ساتھ چلی چلو۔''

عبدالرحمٰن کہیں باہر نکلنے کے لیے کمرے میں تیار ہورہے تھے کہ بتولن بی نے پکار کر کہا، ''بیٹا عبدالرحمٰن! ہم لوگ منیر شریف فاتحہ پڑھے کو دن بھر کے لیے جارہے ہیں۔ دروازے میں تالا لگا دو گے بیٹا۔ دکان جائے (جانے) سے پہلے۔''

ایک نئی کاہی رنگ کی چادر انہوں نے سحر کے ہاتھ میں پکڑائی اور کہا، ''نہا دھو کے اوپر سے یہی چادر اوڑھ لوگی سحر۔''

سحر آج ماں کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اسے واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ اسے کیوں لے جارہی ہیں۔ اب میری زندگی میں کون سی بہار آسکتی ہے، سب کچھ تو ختم ہو چکا

تھا۔اس نے اپنے دل میں سوچا لیکن پھر بھی ماں کے آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج چکا تھا اور اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور جائے گی۔

''کہا تو امّاں کہ تمرے ساتھ چلیں گے بھائی۔چلیں گے۔''

بتولن بی مسکرانے لگیں۔

سلان گنج کی گلی کے پاس سے آٹو رکشہ لے کر دونوں ماں بیٹی منیر شریف کی سمت روانہ ہو گئیں، جو کہ وہاں سے کم از کم دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔اس کی قسمت نے تو ہر حسین خواب کو اپنے ہاتھوں سے جھٹک کر کہیں دُور پھینک دیا تھا۔اس نے بہار کے موسم میں رہ کر کیسی کیسی تمناؤں کو پالا تھا، لیکن آج اس کے اردگرد کچھ بھی نہیں بچا تھا۔نہ تمنائیں، نہ آرزوئیں، نہ کوئی اُمید اور نہ ان پھولوں کی خوشبو۔وہ اپنی ماں کی دی ہوئی کاہی چادر اوڑھے ماں کے کمزور ہاتھوں کو پکڑے پکڑے منیر شریف کی درگاہ پر ننگے پاؤں جانے لگے۔مزار مبارک، جو ایک بلندی پر، بہت چوڑے چھلکے درخت کے تنے کے ٹھیک نیچے تھا، سحر اسی طرف گھسٹتی چلی جارہی تھی۔بتولن بی کا ایسا ناتواں جسم ہوتے ہوئے بھی وہ ہر جگہ پر سحر سے آگے ہی آگے چل رہی تھیں۔ان کے دل میں اُمیدیں بندھنی شروع ہو گئی تھیں۔جس آستانے پر بہت دنوں سے انہیں جانے کی تمنا تھی وہ اسی طرف کھنچتی چلی جارہی تھیں۔دُور ہی سے قوالی کئی مختلف آوازوں میں سنائی دے رہی تھی۔کسی کی موٹی آواز تو کسی کی پتلی آواز، لیکن ایک سماں بندھا ہوا تھا۔

اس مزار کا رنگ سفید تھا اور اس چوڑے چھلکے درخت کا سایہ اس قدر گھنا تھا کہ مزار کے سفید رنگ پر ہرے رنگ کا عکس چھا چکا تھا۔اسی درخت کے تنے سے متصل، ایک اینٹوں کی جالی والی دیوار مزار کے پشت میں کھڑی تھی جس کے خانے میں پریشان حال دُعائیں لکھ کر، کوئی منت کا دیا روشن کر دیتا، کوئی لال دھاگا باندھ کر سر جھکا کر منت مانگ رہا تھا۔گھنے درخت کے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر مزار

پر روشنی بکھیر رہی تھیں۔ سحر کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کی پتیوں کی ٹوکری اور چادر تھی جو بتولن بی نے اسے خرید کر دی تھی۔ مزار کے سرہانے لوبان سلگ رہا تھا۔ بتولن بی تو نہ جانے کتنے مزاروں پر حاضری دے چکی تھیں لیکن یہاں آ کر ان کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو تیرنے لگے۔ انہوں نے سحر کو اشارے سے کچھ پڑھنے اور دُعا کرنے کو کہا۔ اگر بتولن بی کا بس چلتا تو درگاہ کے آس پاس ہی اپنی بچی بچائی زندگی گزار دیتیں۔ انہوں نے مزار کو چوما اور اس کے چاروں طرف گھومنے کو اُٹھیں تو سحر نے انہیں روک دیا اور آہستہ آہستہ سے کہنے لگی۔

''ابا جی (میرے ابا کو وہ ابا جی کہتی تھی) نے اُردو پڑھاتے وقت بتایا تھا اماں کہ اس طرح سے مزاروں کے چاروں طرف گھومنا اور مزار کو بوسہ دینا ہندوؤں کی طرف سے ہم مسلمانوں میں آ گیا ہے۔ یہ مت کریں۔ یہ غلط ہے۔''

بتولن بی نے اشارے سے سحر کو چپ رہنے کے لیے کہا۔ سحر نے اپنی آنکھیں بند کر کے فاتحہ پڑھا اور پھر سوچنے لگی۔

''ماں یہ مجھے کون سی منزل، کون سی خوشی کے لیے ان ہاتھوں کو دُعا کے لیے اُٹھانے کو کہتی ہے۔ میری منزل مقصود ہے کون سی؟ اس منزل کی تو رہ گزر ہی کھو چکی ہے۔''

ماں کا دیا ہوا لمبا چوڑا کاہی دوپٹہ آستانے کی بلندی پر غبار آلود ہوتا ہوا زمین پر گھسٹتا ہوا، اُوپر جا رہا تھا اور اس دوپٹے میں سحر لپٹی ہوئی بے مقصد بلندی پر چڑھی چلی جا رہی تھی۔ وہ یہ سوچتی جا رہی تھی......

''ہم تو اپنی زندگی کی رہ گزر پر بس ایک غبار ہی بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ڈالیاں، پھول پتے، سب کے سب مجھے دیکھ کر حیران ہیں اور منتظر بھی ہیں یہ سننے کے لیے کہ میں کون سی دُعا کے لیے اپنے لب کھولتی ہوں۔ میرے پاس مانگنے کے لیے بھی اب کچھ نہیں ہے۔ جس نے مجھے اپنا بنا لیا تھا، میں ہمیشہ کے لیے

اسی کی ہو چکی ہوں۔ میرے اختیار میں بھی نہیں ہے کہ میں خود کو اس محبت کے طلسم سے آزاد کر لوں۔"

آخر کار ذہن کی کشاکش سے وہ تھک کر وہیں مزار پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی......

میں نے اپنی ماں اور شہزاد کے ماں باپ کے بارے میں سوچ کر کیوں اپنے قدم پیچھے کر لیے۔ کیوں میں قربان ہو جانے کے لیے تیار ہو گئی، اس محبت کے جنون کی کوئی ایسی لہر کیوں نہ آئی جو طوفان بن کر مجھے شہزاد کی بانہوں میں سمو دیتی۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی کی ہو جاتی۔ یہ کیا کیا میں نے......؟"

اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ سینے میں ایسی گھٹن تھی جیسے آرزوؤں کی چتا کا دھواں اس میں بھر گیا ہو۔ کبھی کبھی انسان رشتوں کے قرض کو ادا کرتے کرتے خود ہی جان سے گزر جاتا ہے۔ اس آزمائش بھرے لمحے میں وہ اپنی ماں کی رُسوائی اور بے عزتی کا ہی صرف سوچتی رہی۔ اپنی محبت کو فراموش کر بیٹھی، لیکن جب پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ گیا تو اسے اپنی قوت برداشت کا ادراک ہوا۔ جب محبت کے کیف نے اپنے بال و پر سمیٹ لیے تب اسے خود پر گزرنے والی قیامت کا صحیح میں اندازہ ہوا۔ اسے خود پر اتنا غصہ آتا کہ جی چاہتا اپنا سر خود ہی پھوڑ ڈالے......

"کیا تھا......لوگ کچھ بولتے، باتیں بناتے، پھر چپ ہو جاتے۔ ماں بھی رو دھو کر پھر اپنے گلے سے لگا ہی لیتی، لیکن آج جو درد ہو رہا ہے وہ تو نہ ہوتا۔ زندگی اتنی بوجھل تو نہ بنتی۔ شہزاد کی بربادی کا بوجھ تو سر پہ نہ ہوتا۔ سانسوں کا لینا اتنا مشکل تو نہ ہوتا۔"

سحر وہیں مزار پر بیٹھی بیٹھی اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرتی رہی۔ اس کی رُوح ماتم کناں تھی۔ وہ انہیں منتشر خیالوں میں ڈُوبی اپنی گرد آلودہ کاہی چادر کو سمیٹ کر مزار کے قریب ہی نڈھال ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ بتولن بی نے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کو بڑے ہی پیار سے اپنی طرف موڑا اور رونے لگیں۔

''میری بابو، توں (تم) ٹھیک ہو جاؤ بابو، اپنے دل کو سمجھاؤ سحر، اب تو توری شادی ہوگئی۔ اب تو اسی سے دل لگاؤ۔''

سحر نے کوئی جواب نہیں دیا اور ماں کے گلے سے لپٹ کر بے تحاشہ رونے لگی۔ ایسا لگا جیسے یہ دونوں ماں بیٹی اپنا دل ہلکا کرنے کو آئی تھیں اور کچھ نہیں۔

دونوں ماں بیٹی جب گھر واپس آئیں تو عبدالرحمٰن دونوں کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ سحر بہت ہی کھوئی کھوئی سی تھی۔ وہ چھن پٹک جیسے دور رکھ آئی ہو اور خاموشی سے گھر کے کام میں منہمک ہوگئی، لیکن عبدالرحمٰن کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

سحر کے سارے تصوّرات لمحہ بہ لمحہ جیسے کسی دھیمی سی آنچ کے تلے، قطرہ قطرہ پگھلے جارہے تھے۔اب اس کی جھولی میں بس ایک پہاڑسی ویران زندگی پڑی نظر آرہی تھی۔شوہر کا دن رات اس طرح سے کمرے میں پڑے رہنا اب اسے کھلنے لگا تھا۔اس گھر میں اس کا وجود اسے اس کے خوابوں کو مسمار کرنے والی رات اور دن کی یاددہانی کراتا تھا اور کچھ بھی نہیں۔اس خواب نے اس کی زندگی کے لمحات کو جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ ایسے مرجھائے لمحے، جن پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں سے بھی کوئی اثر نہیں پڑنے والا تھا۔اس پر ایک ایسی بے بسی کا علم طاری رہتا کہ اسے آگے پیچھے، دائیں بائیں کسی کو بھی دیکھ کر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اُڑا اُڑا سا بے رونق چہرہ لیے،ہم لوگوں کے گھر آتی جاتی رہی۔ہم لوگوں کے گھر آتی تو کہتی۔

''تم لوگوں ے یہاں پہلے کتنے خوب صورت خوب صورت پھول کھلتے تھے،مگر اب باغ میں ویسے حسین پھول نہیں کھلتے ہیں نا،کیوں؟''

میں اسے تعجب سے دیکھتی، ''نہیں سحر، پھول تو جس طرح سے پچھلے سال کیاریوں میں لگائے تھے ویسے ہی اس سال بھی لگے ہیں۔دیکھو گلاب،چنبیلی اور بیلا......سب تو موجود ہیں۔تم کون سے پھول کی تلاش میں ہو؟''

وہ کچھ اُلجھے اُلجھے لہجے میں بولی، ''پتہ نہیں۔مگر پھر بھی اس میں پھول ویسے حسین نہیں کھلتے۔''

مجھے ایسا لگا کہ سحر سے قدرت کا حسن بھی دُور ہوتا جا رہا ہے۔ میں خاموش ہو کر دل ہی دل میں یہ سوچنے لگی......

''نہیں سحر، پھول تو سارے کے سارے ویسے ہی کھلے ہیں لیکن وہ تمہیں ویسے حسین نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس لیے کہ تمہارے دل کا پھول مرجھا گیا ہے۔ تمہارا بیاہ تو بس معاشی آسودگی کے لیے ہوا تھا۔ یہ شادی کیا تھی یہ تو صرف ایک سمجھوتہ تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک کاغذی سمجھوتا تھا۔ تمہاری ماں اور پورے سماج کی سب سے اہم اور اوّلین خواہش تو یہی تھی نا کہ تمہاری جلدی سے شادی ہو جائے، تمہیں ایک بندھن میں باندھ دیا جائے۔ سو وہ خواہش پوری ہوگئی۔ تمہاری پسند ناپسند اور تمہارے خوابوں کو نظرانداز کر کے تمہیں صرف شہانہ جوڑا پہنا دیا جائے۔ مانگ میں سیندور، ناک میں کیل ڈال دی جائے۔ کسی طرح سے تمہیں سہاگن بنا دیا جائے۔ بس ایک فرض نبھانا تھا سو وہ سب کچھ کر دیا گیا اور تمہاری شادی کے بعد پورا معاشرہ اپنے اپنے گھروں میں پُرسکون نیند سو رہا ہے کہ سحر کی شادی ہوگئی۔ اس کا نام کسی کے نام کے ساتھ جڑ گیا اور بس۔ کسی کو بھی یہ فکر نہیں تھی کہ سحر خوش ہے یا نہیں۔ تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں تھا، سوائے میرے۔ بتولن بی اور میرے علاوہ کون جانتا تھا کہ تمہارے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ کسی کو اگر شک بھی ہوا ہوگا تو فرصت کہاں ہے کہ خیریت کے دو سوال ہی پوچھ ڈالے۔''

سحر کا جسم زندہ تھا لیکن اس جسم کے اندر جو رُوح تھی، وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ اس کے چاند ایسے چہرے میں گہن لگ چکا تھا اور وہ ہر سمت سے آتی ہوئی روشنیوں سے ناتا توڑ چکی تھی، جیسے سب سے بہت ہی خفا ہو چکی ہو۔ اپنے زانوؤں پر سر جھکا کر پہروں سوچتی رہتی جانے کیا کیا۔ پہلے اسے کتنا کام رہتا تھا، کھلکھلاتی رہتی تھی، اپنے سوتی کے دوپٹے کو ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے ہوا میں لہرا لہرا کر برق ڈال کر سکھاتی۔ کبھی مجھے کہتی، ''ذرا میرا گیلا دوپٹہ پکڑو تو......'' اور ہم دونوں دیر دیر تک اس کے دوپٹے کو ہوا میں لہراتے

رہتے اور کھلکھلاتے رہتے۔ اپنے سادہ سادہ کپڑوں کو بڑے ہی احتیاط سے دھوتی۔ کاسنی رنگ اُسے بے حد پسند تھا۔ اس لیے وہ اکثر اپنے دوپٹے کو اسی رنگ میں ڈبو دیتی تھی اور اس کی تہوں میں اپنے آرزوؤں کی ابرق کو چھڑک کر تہہ لگا دیتی تھی کہ کوئی دیکھ نہ لے، لیکن صرف میں نے اس کی شور مچاتی ہوئی خوشیوں کو محسوس کیا اور پھر اس کے تپتے ہوئے لمحوں کی گرمی بھی محسوس کی۔

بتولن بی کی خوشی کے لیے قدرت نے ایک اور فرض انجام دے دیا۔ سحر کی کوکھ میں ایک ہلکی سی جنبش نے سحر کو اس طرح سے چونکا دیا کہ اس کے سینے میں اس کا اپنا ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک راکھ کی رنگت سی شاخوں پر زرد پتّے کی طرح لرزنے لگی۔ اس نے وحشت میں اپنے دوپٹے کو اپنے جسم سے نوچ کر زمین پر پھینک دیا اور ایک انجانے خوف سے صرف ایک شک پر ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آئینے میں اپنی اُجاڑ شکل کو دیکھنے لگی جہاں نہ کوئی بندیا تھی نہ سیندور، اور نہ ہی ناک کی کیل تھی۔

اپنی صندل سی پیشانی پر بندیا لگانے کا شوق اسے بچپن سے ہی تھا مگر ماں ہمیشہ اسے ٹوک دیتیں۔

''بندیا ابھی ہی لگا لوگی تو شادی کے بعد کا کروگی جی۔''

لیکن جب وہ وقت آیا تو اس نے نہ ماتھے پر بندیا چپکائی نہ ناک میں کیل ڈالی اور نہ کبھی مانگ میں سیندور لگایا۔ شادی کے دن جب سات سہاگنوں نے گلاب اور موتیے کے سہرے کو ہٹا کر مانگ میں صندل بھرا تو اس کے روئیں روئیں میں ایک درد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اپنے سپنوں کے شہزادے کو اپنی بند آنکھوں میں قید کر کے اس نے اپنے پورے وجود کو ان سبھوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اسے اب کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ اس کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے کون کیا کر رہا ہے۔ ان سب سے وہ بالکل بے خبر تھی۔ بے حسی کے جالے میں اس کے تصور کے سارے لمحے پلٹ کر اپنا رنگ و رُوپ، موسیقیت اور نغمگی کھو چکے تھے۔

اس نے بے چین ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا اور خود سے ہی سوال کیا...... "یہ کیا ہو گیا سحر، یہ تمہارے ساتھ کیا ہو گیا سحر۔ میں اس بچے کو اپنی کوکھ میں نہیں پال سکوں گی۔ اسی آئینے سے گلہ کرتے کرتے وہ نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نئے تجربے کے خوف سے ایک جھلستی ہوا اس کے رگ و پے میں پیوست ہوتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اپنے جسم کو کسی کرب کی زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگی۔ وہ ایک حسین لمحہ جو سہاگنوں کے لیے مسرتوں کی انتہا ہوتا ہے، اس کے لیے عذاب محسوس ہو رہا تھا۔ خدا کا یہ انمول تحفہ اس کے لیے ایک سزا بن گیا تھا۔ وہ اپنے دل میں وسعت ہی نہیں پاتی تھی کہ اس خوشی کا خیر مقدم کر سکے۔"

دن گزرتے گئے۔ سحر کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی۔ ماں کو ایک دن کسی بات پر شک ہوا، پہلے تو زیرِ لب مسکرائیں، پھر بے تحاشہ قہقہہ لگانے لگیں۔

"صاحب اللہ نے میری سن لی۔ سحر اُمید سے ہے۔"

امّی بھی بہت خوش ہوئیں، لیکن سحر جب ہم لوگوں کے گھر آئی تو پہلے سے بھی زیادہ پژمردہ، کمزور، اپنی زندگی سے اور بھی بیزار نظر آئی۔

بتولن بی بس اپنی کہے جا رہی تھیں:

"دیکھیے صاحب! اب ای لڑکی کو اس بچے کے بارے میں سوچنا ہے۔ چھوڑو اپنا دکھڑا بابو...... اوہی پھلم (فلم) والا۔ ختم کرو اوسب کہانی۔ لگ جاؤ اپنی دُنیا میں۔ اب تم ماں بننے والی ہو۔ بہت بڑی جمے داری (ذمہ داری) ہے۔ سحر ہوش میں آ جاؤ۔ ارے او نگوڑا کچھ نا بولے ہے، ای رام کریں یا کرشن کریں۔ ایسا چھٹا راج کون سے بیوی کو ملتے دیکھا ہے۔ صاحب بتایئے نا، نہیں نے؟"

اور پھر اسی طرح کی باتیں کرتی کرتی وہ اپنی دبیز چادر اور کھڑا ون کو سنبھالتی ہوئی گھر چلی جاتیں۔ وہ تو اپنے داماد پر سو جان سے نہال تھیں۔

سحر جس معاشرے میں رہ رہی تھی وہ ایک خاص معاشرہ تھا، جہاں کوئی ایسی سہولت نہیں تھی کہ وہ اپنی من مانی کر پاتی۔ اسے اپنی ماں اور محلّے کے سارے لوگوں کے ساتھ رہنا تھا۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ اس کے حواس کو گم کر چکا تھا، لیکن پھر بھی اچھے یا بُرے دل سے اسے اس تبدیلی کو قبول کرنا ہی پڑا۔ اس لیے اس نے اللہ ربُّ العزت کی منشا کے آگے سر جھکا دیا اور اس بچّے کو دُنیا میں لانے کے لیے بے دلی سے ہی سہی لیکن تیار ہوگئی۔ اس نے کوئی بے جا حرکت نہیں کی کہ اس دُنیا میں جو ابھی آیا نہیں ہے، اسے سزا کیوں دی جائے۔ جس طرح سے عبدالرحمٰن کے نام کے ساتھ اس کا نام اتنے دنوں تک جڑا رہا، انہیں کے دَم سے وہ بیاہتا کہلاتی رہی۔ اسی انداز سے وہ اس فرض کو بھی نبھانے کے لیے تیار ہوگئی تھی، لیکن دن بہ دن اسے اپنے آپ سے جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔ اسے ایسا لگتا کہ جیسے اس نے اس درد کو قبول کر کے ہتھیار ڈال دیا ہو۔

اس کے روئیں روئیں میں جینے کا درد پیوست ہو گیا تھا۔ کبھی بھی ختم نہ ہونے والا سناٹا اس کے جسم و جان میں رچ بس گیا تھا اور پھر ویسی ہی گھٹن بھری فضا میں وہ سانس لینے پر مجبور ہوگئی۔ ہاں اگر کسی وقت سمجھانے کی کوشش کرتیں تو اسے بہت اُلجھن محسوس ہوتی، لیکن پھر دوسرے ہی پل وہ یہ بھی سوچنے لگتی کہ یہ سانسیں وہ اکیلی نہیں لے رہی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی سانس لے رہا ہے۔ وہ اس معصوم جان کی بے بسی پر ترس کھانے لگتی اور پھر اپنی بے بسی کو یاد کر کے زار و قطار رونے لگتی۔

اسی طرح سے کئی ماہ گزر گئے۔ اب جب اسے ماں بننے کا خیال آنے لگتا تو اپنے بچّے کو تصور میں لاکر مسکرانے لگتی۔ اس کے اِردگرد جیسے خوشنما تتلیاں اپنے رنگوں کو بکھیرنے لگیں۔ ماں پر بھی وہ اس شدّت سے نہیں برستی تھی، لیکن شوہر سے جیسا برتاؤ اس کا پہلے تھا، اب بھی ویسا ہی تھا بلکہ ان سے کچھ زیادہ ناراض رہنے لگی تھی۔

ماں نے ایک دن کہا، ''ہائے سحر بیٹا عبدالرحمٰن کے لیے اچھی سی ایک چائے تو بنا کردے آ۔''

''امّاں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہیں دینا ہے تو جا کر دے آؤ''۔ سحر روٹھے پن سے بولی۔

بتولن بی اس کی حالت کے پیش نظر خاموش ہوگئیں اور آئندہ کسی اور خوش گوار حادثے کی اُمید لے کر پھر اپنے معبود سے دُعائیں مانگنے لگیں۔ ان کے لیے یہ بچہ ایک خوشگوار حادثہ ہی تو تھا۔ ان کی آنچل پھیلا کر مانگی ہوئی دُعاؤں کے نتیجے میں خدا کی طرف سے عطا کیا ہوا ایک حسین ثمرہ تھا۔ وہ یہ بخوبی جانتی تھیں کہ سحر ابھی خوش نہیں ہے، لیکن انہیں اُمید تھی کہ شاید بچّے کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا کرشمہ ہو جائے کہ سحر اپنے شوہر کے نزدیک ہو جائے۔ شاید وہ عبدالرحمٰن کے شب و روز سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کے دن خوشی خوشی گزارنے لگے۔ یوں بھی بچّے، میاں بیوی کے درمیان ایک مضبوط کڑی ہوتے ہیں، کیونکہ دونوں کی توجہ بچّے کی ہر ضرورت، ہر تکلیف اور ہر ناز و ادا پر ہوتی ہے۔ بچّے کی ایک مسکان ماں باپ کو ہنسا دیتی ہے اور تکلیف کی ایک شکن بھی دونوں کو بے چین و بے قرار کر دیتی ہے۔ اسی لیے بتولن بی آنے والے کل سے مطمئن تھیں۔

لیکن انسان اپنے دل میں کچھ ارادہ باندھتا ہے اور قدرت کا اپنا ہی لائحہ عمل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، سحر پیلی زرد ہوتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیسی کشمکش اس کے دماغ میں چلتی رہتی تھی۔ اس کی ناتوانی بڑھتی دیکھ کر بتولن بی زبردستی اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ ڈاکٹر بھی اسے

دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے بار بار سحر کو اچھی خوراک لینے اور پُر سکون رہنے کی ہدایت کی۔ اس کا فشارِ خون (بلڈ پریشر) بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ بتولن بی تو یہ سب سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ بے چاری تو سحر کے پیچھے یوں بھی ہلکان رہتی تھیں۔ دُنیا میں عورت ماں بننے والی ہوتی ہے تو اس کا شوہر اس کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی خوراک، دوا دارو اور آرام پر دھیان دیتا ہے لیکن یہاں تو قصہ ہی کچھ اور تھا۔ بتولن بی بے چاری اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ، سحر کی فکر میں نیم جاں ہوتی رہیں۔

پھر ایک شام ایسی آئی کہ بتولن بی کو یک بیک ایسا لگا کہ وہ بیچ سمندر میں کسی بھیانک سے بھنور میں پھنسی چکر کھا رہی ہیں۔ ہر چیز چکر کھا رہی ہے، گھومتی چلی جا رہی ہے اور وہ ڈُوب رہی ہیں۔ ان کے کانوں میں ایک نوزائیدہ بچّے کی آواز بدستور آ رہی ہے جو کہ ان کا نواسہ تھا اور اس بچّے کے رونے کی آواز کے پس منظر میں ایک اور آواز آ رہی تھی جس نے ان کو اس بھنور کی تاریکی میں مکمل طور پر ڈبو دیا۔

پاس ہی کے کرجی ہسپتال میں بینچ پر بیٹھی ہوئی بتولن بی مڈوائف کی آواز سن رہی تھیں......

''ہم لوگ مسز رحمٰن کو نہیں بچا سکے...... یک بیک ان کی حالت خراب ہوگئی اور نبض ایک دم رُک گئی۔''

عبدالرحمٰن جورات سے ہی ہسپتال آئے ہوئے تھے، وہ یہ خبر سن کر بالکل سکتے میں آ گئے اور ساس کے پاس اسی بینچ پر گر سے گئے۔ بتولن بی ''ہائے میری بابو، ہائے میری بابو'' کرتی ہوئی سحر کے کمرے کی طرف دوڑنے لگیں، لیکن وہاں تک پہنچ بھی نہ پائیں، راستے ہی میں سر چکرانے لگا، دُنیا اندھیری ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ نرسوں نے جلدی سے ان کو اُٹھایا اور ایک خالی کمرے میں ان کو لے جا کر لٹا دیا۔

یہ خبر تو غیروں کے لیے بھی ہولناک تھی۔ بتولن بی کے بارے میں کیا پوچھنا تھا۔ اُن کی تو دُنیا ہی لُٹ چکی تھی۔ وہ ایک نخلِ آرزو، جوان کے جینے کا سہارا تھا، مرجھا چکا تھا۔ وہ دیئے کی مدھم لَو، جسے زمانے کی سرد و گرم ہوا سے بچانے کی کوشش میں ان کی ہتھیلیاں آبلہ نما بن چکی تھیں، یکا یک بجھ چکی تھی۔ زندگی

بسر کرنے کا واحد مقصد ختم ہو چکا تھا۔ زمین و آسمان روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھر رہے تھے۔ پوری کائنات، پوری فضا دھواں دھواں سی تھی۔ ایک جان لیوا تیر ان کے جگر کے پار ہو چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی رُوح جسم سے باہر نکل کر ان کی تباہی و بربادی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ سارا عالم ایک گہرے سکوت میں غرق ہو چکا تھا۔ خاموشی......حدِ سماعت تک صرف خاموشی تھی۔

سحر ساری دُنیا سے بے خبر اپنے خوابوں کے شہزادے کو اپنی بند آنکھوں میں سب سے چھپا کر جیسے محوِ خواب تھی۔ اس وقت اس کا حُسن اور بھی دوبالا ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بالکل بے خبر سو رہی ہے۔ ایک بے قراری جو اس کے چہرے سے چوبیس گھنٹے ٹپکتی تھی، اس کی جگہ اب گہرا سکون تھا۔ زندہ رہنے کا جو دُکھ اسے ملا تھا اسی دُکھ نے آج اس کے دونوں ہاتھوں کی زنجیر کو کھول کر اسے آزاد کر دیا، تو اسی کے ساتھ چہرے کی وہ بے قراری بھی غائب ہو گئی اور پھر ایسی نیند آئی کہ ڈُوبتے سورج کے سارے حسین رنگ اسی نیند کے سیلاب میں بہہ گئے۔ اب ساری کی ساری پریشانیاں دُور ہو گئیں۔

سحر، میری سہیلی، مجھے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔ میں سحر کے بستر سے لگی زمین پر بیٹھ گئی اور یہی سوچتی رہی کہ آخر میں کس طرح سے صبر کروں گی، میں سحر کے بغیر کیسے رہوں گی۔ میری ہم راز، میری دوست، میرے ایک ایک پل کی خبر رکھنے والی، مجھے ڈانٹنے والی، میرا کمرہ سجانے والی مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ میں دل ہی دل میں سحر سے شکایت کرنے لگی......

''تجھے خبر تھی سحر کہ میں تجھ سے کس قدر نزدیک تھی......میں تجھ سے کس قدر محبت کرتی تھی۔ پھر مجھے تنہا چھوڑ کر تم کیوں چلی گئیں۔ تم نے تو کئی بار اپنا کرب ہم سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کئی بار تم میرے سامنے کھڑی ہو کر مسکرائی بھی تھیں، قہقہے بھی لگائے تھے، کئی بار خود کو سنبھالا بھی تھا، غبار آلودہ لو کی تمازت کے بہانے اپنے آنچل سے اپنا منہ چھپا کر اپنے دُکھ کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی بارہا کوشش بھی کی

تھی، لیکن سحر تجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں تیرے دُکھ کے ہر رنگ کو پہچانتی ہوں۔ تُو اگر ہنستی بھی تھی تو تیرا دُکھ مجھے صاف نظر آتا تھا۔ تیرے دل کی ایک ایک دھڑکن کی آواز میں نے سنی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تُو اپنے خوابوں کی دھنک رنگ فضاؤں میں پرواز نہ کرسکی...... تُو نے زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔ آج تک صرف جسم زندہ تھا، لیکن رُوح کی موت تو بہت پہلے ہوچکی تھی۔ تجھے جینے کا کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہیے تھا سحر۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تجھے اور سمجھاؤں گی، تجھے یہ بھی بتاؤں گی کہ دُنیا میں بہت ساری لذتیں اور بھی ہیں جن کے سہارے زندگی بسر کی جاسکتی ہے لیکن تُو نے تو مجھے ایک پل کا بھی موقع نہیں دیا۔ تُو نے ماں بن کر اپنا بچہ پالنے کی لذّت تو محسوس ہی نہیں کی، حالانکہ کتنی بڑی نعمت تجھے حاصل ہوگئی تھی جو تیرے جینے کا ایک مضبوط سہارا ہوتی۔ محبت کا ایک خالص پیکر اللہ پاک نے تجھے عطا کیا تھا، لیکن تُو نے اس کی بھی قدر نہ کی...... ہائے سحر، تم کتنی جلد باز نکلیں۔''

بتولن بی کو جب ہوش آیا تو وارڈ کے کمرے سے اُٹھ کر سحر کے کمرے کی طرف نرسوں کی مدد لے کر آنے لگیں۔

''سحر میری بابو...... اُٹھو سحر......!''

لیکن سحر تو بہت دُور جاچکی تھی۔ اس دُنیا کے سارے جھمیلوں، کشمکش، مشکلات، محرومیوں اور زندگی کی اُٹھا پٹک سے عاجز آکر وہ ہمیشہ کے لیے گہری نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ بتولن بی ایک دیوانہ وار اضطراب سے سحر کے چہرے کو چومنے لگیں......

''اُٹھو بابو، دیکھو سحر مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ بابو۔ تو جو کہو ہو، جو چاہو ہو، کرلو۔ مگر ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ بابو۔ تمری ماں دیوانی تمرے بغیر کا کرے گی۔ تم تو جانو ہو بابو! تمرے سوا میرا اور ہے کون؟ ہم کون ارمان لے کے جندہ (زندہ) رہیں گے۔''

بتولن بی سحر کے بیڈ کی پٹی پر اپنا سر پٹکنے لگیں۔ ہم لوگ ان کو روکنے تھامنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن بے سود۔ اچانک کسی بچّے کے رونے کی آواز نے ان کی دیوانگی پر یکلخت بریک لگا دیا۔ انہوں نے چونک کر سحر کے بیڈ کے بغل میں رکھے ہوئے پالنے کی طرف دیکھا۔ چند گھنٹوں کا نوزائیدہ اپنی ناقدری پر پوری قوّت سے چیخ چیخ کر احتجاج کر رہا تھا، یا پھر اسے بھی ماں سے محروم ہو جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ بتولن بی گم سم سی پالنے کی طرف بڑھیں اور بچّے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر جو تڑپ تڑپ کر روئیں تو وہاں موجود تمام آنکھیں پھر سے اشکبار ہو گئیں۔ واقعی اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ہر زخم کا مرہم اور ہر دُکھ کا مداوا اس کے پاس موجود ہے اور اس کی رضا میں کس کا عمل دخل ہے۔

اللہ کی رضا کے سامنے تو سر جھکانا ہی تھا۔ سو وہ بچّے کی دیکھ ریکھ کے لیے اُٹھیں۔ اُٹھیں کیا، خود کو اُٹھایا۔ ایک پہاڑ سے جبر کو کاندھے پہ اُٹھا کر انہیں تو چلنا ہی تھا، حالانکہ ان کے روم روم میں سحر کی جدائی کے زخم رس رہے تھے۔ جسم و جان بے دم ہو رہا تھا۔ امّی سے کہتیں:

''صاحب! جب او ایسی ہٹا کٹا میرے چھوڑ کے چلی گئی تو ای بٹرے کا کا ٹھکانہ ہے صاحب؟ اب کوئی کا بھروسہ نہ رہا صاحب۔''

شروع شروع میں تو غم سے نڈھال رہتیں اور بچّے پر خاطر خواہ دھیان نہیں دے پاتیں۔ محلّے کی کچھ خواتین تھیں جو بچّے کو جا کر دودھ پلا دیتیں۔ بتولن بی کی دلجوئی کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتیں۔ کسی کے کاندھے پر سر رکھ کر رو بھی لیتیں لیکن روز روز کا یہ دکھڑا کون کب تک سنتا اور سنبھالتا، آخر کار خود ہی کمزور جسم اُٹھا کر بچّے کا تھوڑا تھوڑا کام کرنے لگیں۔ بچّے نے بوڑھی نانی ہی کی گود کو ماں کی گود سمجھا۔ اسی بوڑھی گود میں ہمک ہمک کر پلتا رہا۔ بتولن بی کے جسم میں رَتی بھر کی طاقت اب نہیں تھی۔ اکثر وہ بچّے کی معمولی سی جنبش سے لڑھک کر گرنے لگتیں۔

"بتاؤ، ای سب کام میرے نصیب میں لکھا تھا۔ ارے میرے اندر دم ہے سحر، تُو میرے چھوڑ کے کہاں چلی گئی سحر...... بتا تیرے بچّے کو کون دیکھے گا بابو، میرے سے اب ای سب کام نا ہو رہا ہے سحر......"

بتولن بی پھر زار و قطار رونے لگتیں۔ اتنا روتیں کہ محلّے کے لوگوں کو خبر ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی آ کر انہیں سنبھالتا۔ کوئی بچّہ سنبھالتا، کوئی پانی پلانے لگتا اور پھر کسی کے کاندھے پر اپنا سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگتیں۔

سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت عبدالرحمٰن کی تھی۔ زندگی پھولوں کی سیج تو پہلے بھی نہیں تھی لیکن سحر ان پر توجہ دیتی یا نہ دیتی، کم از کم اس کے رُوپ سے تو ان کی محبت سیراب ہو رہی تھی۔ اپنے بچّے کی ماں کی حیثیت سے وہ دل کے اور بھی قریب ہو گئی تھی۔ سحر پر پڑنے والی ان کی ہر نظر والہانہ ہوتی تھی۔ اس کی ایک کراہ ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھی اور وہ سوچتے رہتے تھے کہ اس تکلیف سے کب سحر کو نجات ملے گی، لیکن وہ کج اَدا تو ہر دُکھ سے نجات پا گئی اور ان کے وجود کو ہمیشہ کے لیے گرہن لگا گئی۔

عبدالرحمٰن بچّے کی طرف مڑ کر دیکھتے ضرور تھے لیکن اس سے انہیں کوئی خاص دلچسپی تھی نہیں۔ صرف بتولن بی کی مدد کے لیے بچّے کا کچھ کام کر دیتے۔ بچّے کو کبھی گود میں لے کر ٹہلا دیتے، کبھی اسے روتا دیکھتے تو منھ میں دودھ دانی ڈال دیتے۔ کھڑے ہو کر ٹہلانے کا دم خم تو بتولن بی میں تھا نہیں، اس لیے انہیں ان پر ترس آتا اور اپنے کمرے سے باہر نکل کر ان کی مدد کر دیا کرتے۔ عبدالرحمٰن کی ماں نے کہا بھی کہ "اگر کہو تو میں آ جاؤں" لیکن ان میں بھی کتنا دم تھا کہ وہ بتولن بی کی کوئی مدد کر سکتیں۔ پھر ان کے رہن سہن اور بتولن بی کے رہن سہن میں آسمان زمین کا فرق تھا۔

ان کی شکستہ رُوح پر سحر کی جدائی کا ایک ایک پل اُتر کر اسے اور بھی لہولہان کر رہا تھا۔ وہ ہر لمحہ تڑپ رہے تھے۔ ماں نے پھر کہلوایا کہ "اگر تم چاہو تو میں آ جاؤں" لیکن انہیں بھی منع کر دیا کہ یہاں کا کام بڑھ جائے گا۔ وہ آ کر کریں گی بھی کیا۔ انہی تو بس تنہا اسی گھر میں رہنا تھا۔ بتولن بی کی تھوڑی بہت مدد کرنے

کے بعد وہ اپنے غم کدے میں اپنے گھٹنوں پر سر کو جھکا کر بیٹھے رہتے۔ اسی حالت میں انہیں سکون حاصل ہوتا تھا۔ دل و دماغ تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ سحر کے قدموں کی ناراض آہٹیں، اس کی چھن پٹک تو اسی دالان اور آنگن سے وابستہ تھی۔ اس لیے وہ اس تنگ و تاریک گھر کو اپنے جیتے جی کبھی چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ سحر اپنی زندگی میں کبھی ان سے خوش دلی سے یا مسکرا کر ہی بات کر لیتی تو نہ جانے وہ اس انمول گھڑی کا کیا صدقہ اُتارتے، لیکن سحر کے رویّے کو بھی انہوں نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا اور زبان پر آج تک اُف نہیں لائے۔ بتولن بی سے کبھی بھی ان کی بیٹی کی شکایت نہیں کی بلکہ ہمیشہ وہی سمجھاتے رہے کہ گھبرایئے مت، سحر ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ ہمیشہ ہی سحر کا دل ہی دل میں انتظار کرتے اور آہستہ سے بُدبُداتے ...... ''ایک دن، وہ دن بھی آئے گا''، لیکن وہ دن تو کبھی نہیں آیا اور جس طرح سے وہ بگڑ کر گھر سے گلی میں نکل جاتی تھی، اسی طرح سے وہ عبدالرحمٰن سے خفا ہو کر اس دُنیا ہی سے چلی گئی۔

وہ جب سحر کے بارے میں سوچتے، جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ سحر کی سوچ اور اس کا خیال ہر لمحے کا ساتھی تھا۔ جسم میں جیسے کوئی حلاوت باقی ہی نہیں رہی، لیکن زندگی ابھی باقی تھی اور زندگی کے شب و روز اپنے ہونے کا محصول لیتے رہے۔ سب کچھ ایک روٹین کی طرح چل رہا تھا، لیکن جینے کی اُمنگ ختم ہو چکی تھی۔ زندگی کی بقاء مقصد کے حصول اور آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر تگ و دو میں ہے۔ سحر ان سے ناراض رہتی، چھن پٹک کرتی، ان کی جانب سے منھ موڑ کر چلا کرتی لیکن ایک دن سب اچھا ہو جانے کی روپہلی اُمید ان کے جسم میں جان بن کر دوڑا کرتی تھی۔

اب ساری اُمیدیں، آرزوئیں، اُمنگیں فنا ہو چکی تھیں۔ ایک بے جان جسم تھا کہ صبح کو شام کر رہا تھا۔ دل سوزی کا غم رفتہ رفتہ ان کے جسم کو گھن کی طرح چاٹ گیا۔ ہلکے ہلکے بخار نے پھر ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر لی اور پھر وہی بخار ان کی موت کا سامان بن گیا۔ لکھنؤ سے روتے بلکتے ان کے ماں باپ آئے اور

نامراد بیٹے کی لاش لے کر واپس چلے گئے۔ وضع دار لوگ تھے، زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن جاتے جاتے فریدہ بیگم نے ایسی شاکی اور زخمی نظروں سے بتولن بی کو دیکھا کہ ان کے وجود کی عمارت ہل گئی۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے خوشیوں اور رونقوں کی چاہ میں بیٹے کی شادی کی لیکن انہیں کیا حاصل ہوا۔ جیتے جی بیٹا نظروں سے تو دُور ہوا ہی تھا پھر ہمیشہ ہی کے لیے جدا ہو گیا۔ کوئی ویرانی سے ویرانی تھی۔ عبدالرحمٰن کی تشنہ زندگی، اس کے بے رونق شب و روز اور اس کے دردناک انجام نے میرے سامنے کئی سوال کھڑے کر دیے۔ کس نے سحر کو جی جان سے چاہا...... شہزاد نے یا عبدالرحمٰن نے؟ نارسائی تو دونوں کا نصیب بنی۔ عشق کا لقمۂ تر تینوں بن گئے...... سحر، شہزاد اور عبدالرحمٰن۔ ہائے عشق، تیرے کرشمے نرالے ہیں!

بتولن بی پر یہ دوسرا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سحر کے جانے کے بعد تو وہ عبدالرحمٰن ہی کی طرف اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھتی تھیں۔ وہی تو اب زندگی کے واحد ساتھی رہ گئے تھے جن کے ساتھ مل جل کر اس چھوٹی سی جان کو وہ پال رہی تھیں۔ بتولن بی کے جسم کی توانائی تو سحر کے ساتھ ہی روانہ ہو چکی تھی۔ اس پر بھی گھر اور باہر کے زیادہ تر کام تو بتولن بی لنگڑا لنگڑا کر خود ہی کرتی تھیں۔ اتنی مجبور ہو کر بھی انہیں کسی سے آس لگانے کی عادت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنا کام خود ہی، کسی نہ کسی طرح سے پورا کر لیتی تھیں۔ پھر بھی گھر میں عبدالرحمٰن کی شکل میں ایک مرد کا وجود تھا جس سے ان کو تقویت ہوتی تھی، لیکن وہ بھی ان کے نصیب میں نہ رہا۔ اور اب وہ ایک بے ماں باپ کے بے بس بچّے کی ماں بن کر زندگی کے دن گزارنے کے لیے کھڑی تھیں۔

بتولن بی گھر کا کام کرتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ اپنی آنکھوں کو اپنے آنچل سے خشک کرتی ہوئی سحر سے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی رہتیں......

"کا (کیا) سحر ای (یہ) اتنی بڑی جمہ داری (ذمہ داری) میرے جان پہ چھوڑ کے چلی گئی سحر۔ ارے میرے جان میں اتنا دم ہے کی، ای بُترا (بچّہ) کو ہم پال سکیں گے سحر...... ہم کیسے کا کریں گے......؟"

ہم لوگوں کے گھر آتیں تو گھنٹوں نواسے کو لے کے بیٹھی رہتیں۔ اسے دودھ پلاتیں، تھوڑا تھوڑا کھلاتی پلاتی رہتیں۔ کبھی کبھی خاموشی سے آنسو بہاتیں۔ کبھی کسی نے خیریت پوچھ لی تو وہ پھوٹ پڑتیں:

پرسشِ احوال کی کوشش کبھو مت کیجو

بڑی آزردگی کے ساتھ امّی سے کہتیں:

''صاحب، آپ کے گھر سے کہیں جائے کا جی نہ چاہے ہے۔ گھر تو صاحب کاٹے کو دوڑے ہے۔ بتایئے نا، کہاں جائیں، کہیں چین نا ملے ہے صاحب۔''

امّی انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتیں:

''بتولن بی آپ ایسی غیریت کی بات کیوں کرتی ہیں۔ اس گھر کو بھی آپ اپنا ہی گھر سمجھیے۔ آپ کا جب دل چاہے آجایئے اور جتنی دیر بھی یہاں رہنا ہے، رہ لیجیے۔ ان باتوں کی آپ فکر بھی مت کیجیے۔''

اسی طرح سے وقت گزرتا رہا۔ کبھی رو کر، تو کبھی خاموشی سادھ کر۔ بتولن بی کو اپنے دُکھوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ آ گیا تھا۔

اب بتولن بی کی آواز میں سحر، سحر کی رٹ بدل چکی تھی۔ اب صرف جلّو جلّو ہی کی دھن تھی۔ جلّو کا پورا نام محمد جلال الدین رکھا گیا تھا۔ ان کی پوری زندگی اب بچّے کے اردگرد ہی منڈلا رہی تھی۔ ان کے جسم میں جتنی بھی طاقت ہو، وہ بچہ اپنی نانی کے آنچل کے سائے میں پل رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے بس وہ تھیں اور جلّو تھے۔

''اُٹھو جلّو صبح ہوگئی...... منھ دھولو جلّو ...... ناشتہ کھالو جلّو۔''

جلّو نے ماں کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، اس نے نانی کو ہی ماں سمجھا۔ انہیں کے ساتھ ہنستا بولتا، اپنا سارا لاڈ انہیں کے آگے کرتا اور بتولن بی بھی اس بچّے پر اپنی جان کو صبح سے شام تک نچھاور کرتی رہتیں۔ سحر کا غم تو اُٹھتے بیٹھتے ان کے دم کے ساتھ تھا، لیکن جلّو کی مسکراہٹ اور توتلی بولی پر دل و جان سے فدا ہوتی رہتیں۔

جلّو میاں اب بڑے ہو رہے تھے۔ سات آٹھ سال تو یوں پلک جھپکتے ہی گزر جاتا ہے۔ بتولن بی ہم لوگوں کے یہاں بدستور آتی رہیں۔ ساتھ میں جلّو بھی اُچھل اُچھل کر نانی کے ساتھ آتے رہے۔ ہم لوگوں کے گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتا تھا۔ بہت ہی پیارا بچّہ تھا۔ کبھی بھی اس نے کوئی ایسی شرارت نہیں کی جیسا کہ عام طور پر اور بچّے کیا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اس کی شرارت سے کبھی بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

جلّو میاں مدرسہ پابندی سے جاتے اور قرآن کی تلاوت روز صبح سویرے اُٹھ کر سب سے پہلے کرتے۔ یہ بتولن بی کا حکم تھا کہ قرآن کی تلاوت اور نماز کے بغیر دوسرا کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ پہلے نماز اور قرآن، تب کچھ اور۔ اسی مدرسے میں تھوڑی اُردو پڑھتا اور حساب کی پڑھائی بھی ہو رہی تھی۔ نانی ہم لوگوں کے گھر آ کر جلّو میاں کی ایسی ایسی تعریفیں کرتیں کہ بیان سے باہر اور وہ بھی اپنی تعریفیں سن سن کر مسکراتے رہتے۔

جلّو کی شکل وصورت بالکل باپ پر گئی تھی لیکن سحر کے چہرے کے بھولا پن کا عکس اس کے چہرے پر بہت نمایاں تھا۔ اسی بھولے پن کو دیکھ کر بتولن بی اس کے ہر انداز پر رات اور دن فدا ہوتی رہتیں۔ اس کی باتوں پر ایسا ٹھہا کا لگا کر ہنستیں کہ کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا کہ سحر کو اب بتولن بی جیسے بھول چکی ہیں۔

انہوں نے نہ جانے کتنے غم جھیلے تھے۔ ایک کے بعد دوسرے غم سے نڈھال ہوتی رہیں۔ پھر اسے سہہ کر اور ٹوٹتی ہمت کو یکجا کر کے اُٹھ کھڑی ہوتیں۔ ہم لوگوں کے گھر آ کر پھر سبزی کا تھیلا ہاتھ میں پکڑ کر سڑک پہ لنگڑاتی ہوئی بازار جاتی رہیں۔ ایسا غم انسان کبھی بھولتا تو نہیں ہے، لیکن وقت بذات خود ہی ایک مرہم ہے جو تکلیف کی شدّت کو تو ضرور ہی کم کر دیتا ہے۔ جب بتولن بی کے شوہر کا بزنس ان کے پارٹنر نے دھوکے سے اپنے نام کرا لیا تھا، تب بتولن بی کے گھر میں کچھ ایسا سماں پیدا ہو گیا تھا جیسے کسی کی موت ہو گئی ہے، لیکن پھر یہی سوچ کر صبر کر لیا کہ چلو پیسہ ہی نا گیا...... جان تو سلامت ہے اور پھر دونوں میاں بیوی

نے سحر کے ساتھ زندگی ایک نئے سرے سے شروع کی۔اس کے بعد ان کے شوہر جب اس دُنیا سے چلے گئے تو سحر کی خاطر اپنی ہمت کو کسی طرح بٹور کر کے سلطان گنج کی گلیوں میں چل پڑیں۔شوہر کے بعد سحر ہی ان کے لیے سب کچھ تھی، لیکن اب ایک آخری چراغ جلّو، ان کی زندگی میں ایک ایسی روشنی پھیلا رہا تھا جس میں ان کی زندگی کے تاریک کونے کھدرے روشن ہو گئے تھے۔اسے ہی دیکھ کر ان کے کھڑاون میں جیسے پھر سے طاقت آ گئی تھی اور ان کے ہونٹ پھر سے مسکرانے لگے تھے۔

شوہر کی ناگہانی موت، سحر کا ایسی جوانی میں دُنیا سے چلے جانا اور داماد کا غم سے چُور ہو کر انتقال کر جانا، ان سارے دُکھوں کو بتولن بی نے پرے رکھ دیا تھا اور اپنی بڑھاپے کی لاٹھی کو لیے لیے ہر جگہ اس کے ساتھ جاتیں، مسکراتیں اور قہقہہ بھی لگاتیں...... اور وہ کر ہی کیا سکتی تھیں۔اس بوڑھی، غریب اور ناتواں عورت کے پاس سوائے جلّو کے اور تھا ہی کیا۔عمرِ رواں کا اثر صحت پر نمایاں ہو رہا تھا۔جسم کے جوڑ جوڑ میں ایسی ٹیک رہتی تھی کہ اُٹھنا بیٹھنا محال رہتا۔لیکن ایسی ہی حالت میں کام کرتی رہیں۔

''سوچیں ہیں صاحب کہ اگر بیٹھ گئے تو پھر ساید (شاید) ہمیشہ کے لیے بیٹھ جائیں گے۔اسی لیے کام ہی کرنا بہتر ہے۔''

میں چپ کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میں نے بچپن سے آج تک نہ جانے کتنی کہانیاں پڑھی ہیں، داستانیں سنی ہیں، کتنی شاموں کی کہانیاں، اندھیری راتوں کی کہانیاں، جلتے سورج کی تپش میں تھکے ہوئے قدموں کی کہانیاں، وطن چھوڑنے کی کہانیاں، ایک جُگ بیت جانے کے بعد وطن واپس آنے کی کہانیاں، جنگل کی، بیاباں کی، صحراؤں کی کہانیاں...... لیکن سحر اور بتولن بی کی کہانی ایک ایسی کہانی تھی جس کا اثر بڑی شدّت سے اس ماحول میں نمایاں ہو گیا تھا۔اس کہانی سے آس پاس کے سبھی لوگوں پر کچھ عجیب قسم کا اثر پڑا تھا۔سبھی کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ سارا غم ان کے اپنے گھر کا غم ہے۔

یہ کہانی ایک ایسی کہانی تھی جو میری زندگی میں، مجھ سے قدم سے قدم ملا کر جیسے مجھے اپنے ساتھ ساتھ لیتی چلی جا رہی ہو۔ میرے شب و روز، اُٹھنے بیٹھنے، کھیلنے کودنے کا تعلق براہ راست اس کہانی سے تھا۔ میں اس کہانی کا ایک اہم کردار تھی۔ ایک ایسا کردار جسے کہانی کے دوسرے کرداروں سے بے انتہا، بے پایاں اور بے غرض محبت تھی۔ میں ان کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں اپنی امّی سے ہمیشہ یہی کہتی تھی۔

''امّی بتولن بی اب کہاں جائیں گی۔ ان کا تو سب کچھ لُٹ گیا ہے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز جیسے ان کے آگے کی پگھلتی چلی گئی۔ ان کی ہر چیز کھوتی چلی گئی اور وہ دائیں بائیں مڑ مڑ کر ہر چیز کو حسرت سے دیکھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔''

امّی نے بتولن بی کے لیے ایک کمرہ آنگن کے ایک کونے میں بنوا دیا۔ وہیں ان کی چارپائی اور ایک میز کرسی رکھ دی گئی۔ ان کے چہرے پر ایک سکون کی لہر دوڑ گئی۔ جلّو تو گھر میں ہر جگہ پر رہتے ہی تھے۔ کبھی آنگن میں اپنا چھوٹا سا کھٹولہ، اپنے ہی برابر کا، بچھا لیتا، کبھی دالان کے تخت پر تکیہ لگا کر سو جاتا۔ وہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہی ہم لوگوں کے گھر میں رہنے لگا۔ کبھی نانی کے چھوٹے سے کمرے میں ان کے بستر پر جا کر لیٹ جاتا۔ آنگن کے ایک کونے سے تورئی کی لت چڑھ کر ان کی چھت پر پھیل گئی تھی جسے بتولن بی دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ اس کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر اس کا بچکانہ بنوا لیتیں۔

بتولن بی جب اپنی کمر پکڑ کر دالان کے تخت پر اپنی ناک درد کے مارے چڑھاتے ہوئے بیٹھتیں تو ایسا لگتا جیسے اپنے پورے جسم کی طاقت کو استعمال کر کے بیٹھ رہی ہوں۔ انہیں اس تکلیف میں دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوتا۔ ان کے کھڑاون کی خاص آواز، اس کھڑاون کی تال پر ٹائیگر (جو میرے کُتّے کا نام تھا) کا آواز ملا کر بھونکنا، بازار سے سودا لانے کا سبز تھیلا ہاتھ میں پکڑ کر وہ کس طرح سے تخت پر بیٹھتیں...... وہ سارے انداز میری آنکھوں کے سامنے آج بھی رقصاں ہیں اور مجھ میں جیسے جذب ہو گئے ہیں۔ میں

جب بھی چاہوں ان لمحوں کو اپنی آنکھوں سے ابھی بھی دیکھ سکتی ہوں۔

سحر کا حسن، اس کے سادے کپڑے پر رنگ برنگی لہریا دوپٹہ، اس کا کھلکھلا کر ہنسنا، کسی کو دیکھ کر جلدی سے خاموش ہو جانا۔ کس طرح سے وہ ہم لوگوں کے ساتھ رہ کر تعلیم پا گئی اور چند سالوں کے اندر ہی اپنے نظریے کو بدلتی گئی۔ کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر کیسی کیسی رُسوائی ہوئی، دلگیر ہوئی اور پھر کیسے خود سے پندرہ سال بڑے شوہر کے ساتھ شب و روز گزارے...... یہ سب کچھ کہانی کے اندر تھا اور اس کے ہر کردار کے مسائل کا بوجھ جیسے میرے کاندھوں پر تھا۔ اور میں نے اپنی لیاقت کے حساب سے اپنی اس کم عمری میں ہر طرح سے مدد کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ قدرت کا اپنا فیصلہ الگ ہوتا ہے۔ آپ کچھ بھی کر لیں، جو ہونا طے ہے، وہی ہوتا ہے۔

ہاں میں یہ مانتی ہوں کہ ان لوگوں نے بھی مجھ سے بے پناہ محبت کی۔ سحر میرا کمرہ سجا دیتی تھی۔ میری بکھری کتابوں کو شیلف پر رکھتے وقت مجھے ڈانٹتی بھی جاتی اور کہتی۔

''تم اپنی چیزوں کو سنبھال کر کیوں نہیں رکھتی ہو۔ کوڑا خانہ لگ رہا ہے۔''

اور میں جواب میں اس کی گردن میں باہیں ڈال کر ہنسنے لگتی تھی، ''تم جب ہو سحر تو مجھے کس چیز کی فکر؟ ہاں؟ ہاں؟''

پھر میں اسے گدگدانے لگتی اور وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ ذرا سی بھی میری طبیعت خراب ہوتی تھی تو بتولن بی اپنے کتھے اور چونے لگی اُنگلیوں سے میرے ماتھے کو ضرور چھو کر دیکھتیں۔

''ہاں ہاں بخار ہے۔ ہائے کہاں دُکھے ہے میری بابو۔''

ہم تو رو بھی نہیں رہے تھے اور وہ کہنے لگتیں، ''چُو چُو...... چُو چُو...... روؤ مت، مسوسو بابو...... مسوسو نے (برداشت کرو)، اللہ اچھا کر دے گا بیٹی، پریشان مت ہوؤ۔''

خود کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتیں، پھر امّی کو پکارتیں۔

''اے صاحب آیئے نا، بُنّی کے سرہانے بیٹھیے نا۔ اجی ماں کی خوشبو سے بخار بھاگے ہے جی۔''

ہم ہنسنے لگتے تو کہتیں، ''تو ہم کا غلط کہہ رہے ہیں۔ اجی ہاں جی بخار بھاگ جاہے۔''

اور واقعی یہ بات ان کی بہت سچ تھی کہ امّی جب آتیں اور اپنے نرم نرم ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑتیں تو جیسے میری طبیعت بشاش ہو جاتی۔ وہ بہت خوش ہوتیں جب میں یہ کہتی۔

''بتولن بی آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ دیکھئے امّی کے آتے ہی میں کیسی چنگی ہوگئی۔''

بتولن بی کھکھلا کر ہنسنے لگیں جیسے کہ ان کا کہا ہوا سچ ہو گیا۔

''ارے ہم کا اوڑی بوڑی (اول فول) تھوڑا ہی بولیں ہی جی''۔ پھر ریگھا ریگھا کر کہنے لگیں، ''اجی مائے کے آنچل کی ہوا مائے (ماں) کے ہاتھ کی گرمی میں ایسی شفا ہے کوئی سوچ نہ سکے ہے''۔ پھ زار و قطار رونے لگیں، ''ہائے ہم اپنی لال کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے بُنّی۔ ایسی ہاتھی ایسی میاں کیسے میرے چھوڑ کے چلی گئی۔''

جلّو وہیں پر کھڑے تھے۔ اس نے جیسے ہی نانی کو یہ کہتے ہوئے سنا نانی کے پاس آ کر چپک گیا۔ اس بچّے کے لیے نانی ہی بس اس کی دُنیا تھیں۔ باپ بھی تھیں اور ماں بھی تھیں۔

جلّو کی عمر اب قریب آٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی قیامت کے بعد ایک دن کے بچّے کو بتولن بی نے اپنی گود میں لیا تھا اور اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ جلّو میاں دُبلے پتلے سے...... چہرے کے حساب سے کان ذرا بڑا تھا۔ ہنستے تھے تو فوراً بتیسی نکل جاتی تھی۔ بتولن بی اس کے سر میں چمیلی کا تیل لگاتی تھیں اور وہ آئینہ دیکھ دیکھ کر خوب اپنا بال سنوارتا تھا۔

وہ یہ جانتا تھا کہ یہ میری نانی ہیں جن کو وہ نانو کہہ کر پکارتا۔ ماں کو تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں، نانی

ہی کے سائے تلے چلتا رہا اور بتولن بی بھی بڑے حب دلی سے اس کے ناز نخروں کو سہتی گئیں اور جلّو ان کے دل میں سحر کی جگہ لے کر انہیں اپنی پیاری پیاری باتوں سے بہلاتا رہا۔ بدمعاشی بھی کرتا تو خاموشی سے کرتا۔ جہاں بتولن بی نے کھانے کو کہا تو ہم لوگوں کے گھر میں چھپ کر کہیں پر بیٹھ جاتا اور ایسا چھپتا کہ ایک دو گھنٹے کے لیے غائب ہو جاتا۔ بتولن بی پہلے تو پکارتی رہتیں۔

''جلّو ...... جلّو ...... اجی جلسو کہاں ہے بیٹا''۔ پھر زار و قطار رونے لگتیں، ''ہائے ہائے صبح سے ایک دانہ بھی منھ میں نا گیا ہے۔ اور اب تو نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

ہم لوگ سمجھاتے کہ بتولن بی آپ اتنا کیوں گھبرا جاتی ہیں، یہیں کہیں گھر پر ہوگا بتولن بی۔

''نا بابو اب میرا جی خراب لگ رہا ہے۔ دیکھو نے بابو یہی نے میری دُنیا ہے۔ ای (یہ) ایسے چلا جا ہے تو جی اُلٹے لگے ہی بُنّی۔ چلا گیا ہوگا کہیں بجار (بازار) میں بھٹلا گیا ہوگا اور کا۔''

پھر تو پورا کا پورا گھر جلّو کو کھوجنے میں منہمک ہو گیا۔ بہت دیر تک کھوجنے کے بعد ہم لوگوں کے گھر میں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جہاں الّم غلّم چیزیں رکھی رہتی تھیں، وہیں ایک کونے میں جلّو پسینے پسینے اپنے مصمم ارادے کے ساتھ نانی سے خفا ہو کر کھڑے ہوئے تھے۔

وہاں سے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر لائی اور بتولن بی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بتولن بی نے اسے دیکھا تو اور زور سے رونے لگیں۔

''کہاں تھے جلّو، ارے کہاں چلا گیا تھا بابو...... کا بجار چلا گیا تھا۔ ہائے ایسا پسینے پسینے کا ہے ہو رہا ہے میرا لال۔ ہائے بُنّی توں تو دیکھو ای ایسا کا ہے ہو رہا ہے۔''

میں نے بتولن بی کو سمجھایا، ''آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ اس کوٹھری کو جا کر دیکھا ہے کبھی کہ وہاں کیسی گرمی ہے۔''

''ہائے ہواں تھا ای نگوڑا، ہائے ہواں اگر اس کو سانپ کاٹ لیتا تو ابھی ہم بھلا کا کرتے۔ ہائے رے میرا نصیب، ہائے بابوا ای میرے ایسے ایسے ستاوے ہے، ہائے رے میرا کرم تو دیکھ لیو بابو کی کا کا نا ہوا۔ ہائے اللہ ہم کا کریں، کہاں چلے جائیں، کہاں بلا جائیں......''

جلّو خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ پھر آہستہ سے کہتا، ''نانو دیکھو اگر پھر میرے کھائے کو کہو گی تو ہم بازار چلے جائیں گے اور ہوئیں جا کے بھُتلا (بھُلا) جائیں گے۔ پھر تم خوب روؤ گی۔ بتا دیں ہیں۔''

یہ سن کر سب لوگ تو ہنسنے لگے لیکن بتولن بی پھر سے زاروقطار رونے لگتیں۔

''دیکھو بُنّی، دیکھو بُنّی ای کا کا بولے جا رہا ہے۔ آئیں آئیں کا بولا، ابولا۔ تم میرے چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟''

اس کے بعد بتولن بی پر ایک جنون سا طاری ہو جاتا۔ روتے روتے اُٹھ کھڑی ہو گئیں اور جلّو کی طرف غصّے سے بڑھنے لگیں۔ جلّو بڑی معصومیت سے اپنی آنکھیں مچکانے لگے کہ نانی بڑے غصّے میں میرے پاس آ رہی ہے۔

''کا بولا...... کا بولا؟'' اور جلّو کو مارنے کے لیے بہت زوروں سے ہاتھ اُٹھایا لیکن اس کے پیٹھ پر ہاتھ لا کر صرف رکھ دیا۔ مار کیا وہ تو جلّو کو صرف اپنے ہاتھ سے چھو رہی تھیں۔ اور جلّو میاں بھی خوب جانتے تھے کہ یہ مجھے ماریں گی تھوڑا ہی۔ لوگوں پر یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ خوب مار رہی ہیں۔ جلّو رو بھی نہیں رہے تھے بلکہ ہلکے ہلکے مسکرا رہے تھے۔

پھر ہانپتی ہوئی ورنڈے کے تخت پر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

''تمرے ایسے ہی ہم مار مار کے ٹھیک کریں گے۔ ایسے تم ٹھیک تھوڑا ہی ہو گے۔ ای میرے بارے میں نا سوچے ہیں کی میرا کا ہو گا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بابو، اب تو رے ہم کچھ نہ بولیں گی۔ رام کرو

راکس کرو۔ تمرا جو جی چاہے کرو۔ مت کھاؤ پیوارے میرا کاہے رہو، ایسے ہی کھیانے بلانے اور کا۔ بتاؤ بابو جو کھا گانا او کا پڑھے گا اور لکھے گا۔''

جلّو ہر بات کو بڑے غور سے سنتے تھے اور ایک خاص انداز سے سر جھکا کر مسکراتے تھے۔ بتولن بی اسے دیکھ دیکھ کر نہال در نہال بھی ہوتیں اور دوسرے ہی دم سحر کو یاد کر کے اپنی آنکھوں کو اشک بار کر لیتیں۔ لیکن جلّو کو ہدایت بہ دستور دیتی جاتیں۔

جلّو قریب کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے روز جاتے۔ کبھی کبھی گھر واپس آ کر نانو سے ماسٹر کی شکایت بھی کرتے۔

''نانو آج ماسٹر صاحب میرے سزا دیہن (دیا) تھا اور کونے میں کھڑا بھی کر دیہن تھا۔''

اس کے بعد بتولن بی بالکل ہی تڑپ جاتیں، ''ہائے کاہے بابو کاہے، اچھا ماسٹر کی ای مجال۔''

جلّو سے یہ پوچھا بھی نہیں کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اب تو وہ بالکل ہی بپھر گئیں۔

''چھوڑو جلّو تورے مدرسہ جائے کا جرورت نا ہے۔ چھوڑو پڑھائی لکھائی، بس جیو بچو...... جیوگے بچوگے تو کچھ نہ کچھ کر ہی لوگے۔''

جب ہم لوگ یہ کہتے کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں بتولن بی، کیا جلّو پڑھے لکھے گا نہیں، تو کہتیں۔

''اجی جیے گا بچے گا تب نے۔ ابھی تو منھ میں ان کے کھانا ہی نہ ڈھوکے (جاتا) ہے۔ اور ایسا دھان پان بچہ کو ای ماسٹر سجا دے گا۔ بتاؤ جرا...... کا سمجھتا ہے او ماسٹر وا اپنے کو۔''

اس شام کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔محرّم کی دسویں تاریخ تھی۔محلّے میں محرّم کا ہنگامہ تو کئی دنوں سے تھا۔مسلمانوں کے محلّے میں سارے اسلامی تہوار اور تقریبات کی ایک دھوم ہوتی ہے۔میں اپنے دالان میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ سامنے سے پچھلے دروازے کی کنڈی ہلی تو بے ساختہ میری نظر اُوپر کی طرف اُٹھ گئی۔دیکھا کہ بتولن بی اپنے آپ کو سنجالے ہوئے اپنی لاٹھی، بٹوہ اور کھڑاون سمیت ہم لوگوں کے گھر میں اپنے نواسے کے ساتھ داخل ہو رہی ہیں۔ادھر چند ماہ سے وہ لاٹھی لے کر چلنے لگی تھیں۔

''ای لاٹھی لے کے چلے سے ذرا سا آرام ملے ہے بابو......تیسری ٹانگ بن جا ہے۔ایک ٹانگ تو بے کار ہی ہو چکی ہے۔''

''ہاں بتولن بی، ٹھیک ہی تو کرتی ہیں۔اگر آرام ملتا ہے تو لاٹھی لے کر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔''

''ارے بُنّی ہرج ورج ہم نہ جانے......اب جو ہم ہیں تو ای ہی (یہی) ہیں۔بس اور کا۔''

''آئے آئیے بتولن بی۔''

میں اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئی اور ان کو دالان کی سیڑھیوں پر چڑھنے میں مدد کرنے لگی۔بے چاری ہانپتی ہوئی دالان کے تخت پر لاٹھی سمیت بیٹھ گئیں۔جلّو بھی نانی کے ساتھ ساتھ تھے۔ہرا ہرا کرتا، گلے میں

نارہ بدھی، ایک بُن دھنیا سمیت بٹوہ گلے میں ڈالے ہوئے، سفید پاجامہ۔

میں نے جلّو سے پوچھا، ''کیوں جلّو، ساری کی ساری بُن دھنیا گلے میں جیسی کی تیسی ہے۔ تم نے تو میاں اس میں سے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔''

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے، نانی نے فوراً کہا۔

''ارے بُنّی، ان نن کھوتے (بہت کم کھانے والا) کا کا پوچھو ہو۔ چڑیا کا دانی چگیں ہیں۔ او کھالیہن (وہ کھالیا) تو ای نا اور ای کھالیہن تو او نا۔ اے ہی (یہی) تو ان کا حال ہے۔ کھالی (خالی) میرے پریسان (پریشان) کرے پر لگے رہے ہیں۔ اب دیکھو نا بُنّی، راتے (رات) سے کچھ کھا پی نا رہے ہیں۔ بس کہے ہیں کہ بھوک نا ہے، بھوک نا ہے۔ ارے ای تو چڑیا کی کھوراک (خوراک) کھا ہیں اور ذرا سا زور سے بولیں کہ کھاؤ نا بھائی، کاہے کھاؤ گے نا، تو ٹس ٹس آنکھ سے ٹسوا (آنسو) گرے گا۔ تو بولو نا بُنّی، اب ان کو کون بولے کی کھاؤ بھائی کھاؤ۔ ارے ہم تو اے ہی (یہی) کہے ہیں کہ کھاؤ پیو، کھوس (خوش) رہو، مگر نا، او ہی لیچڑ پیچڑ اِدھر اُدھر سے لکھڑاتے پھرے ہیں اور کچھ نا۔ او راتے (رات) کھچڑا کھا کے شبجیا (شبجنی) کے گھر سے آیا ہے۔ او کے بعد سے کچھ بھی منہ میں ڈالے کو تیار ہی نا ہے۔ کا جانے کھانے میں کا کا (کیا کیا) ملا دیں ہیں لوگ بابو!''

میں نے جلّو سے بہت ہی قریب جا کر پوچھا، ''کیا ہوا جلّو، بھوک نہیں لگ رہی ہے۔ کھاؤ پیو گے نہیں تو کھیلو گے کیسے؟''

جواب میں اس نے سر ہلا کر کہا کہ ''نہیں۔''

یعنی بھوک نہیں لگ رہی ہے۔

''ہاں اور سنو بُنّی، کل ای بابو صاحب خوب بھیٹر بھاڑ میں محرّم کا تاجیہ (تعزیہ) بھی دیکھے گئے

تھے۔ ہاتھی پر چڑھے اور جانے کا کا کر کے آئے ہیں۔“

میں نے کہا، ”بتولن بی آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ صرف تھکا ہوا ہے اور کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ نانی کی ایسی بے پناہ محبت میں جلو میاں کا اتنا سا نخرہ کرنا تو یوں بھی واجب ہے۔ میرے دلاسہ دینے کے باوجود بتولن بی کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ پھر بھی وہ اپنے نواسے سے کہنے لگیں۔

”اجی اے جلو، آج اِدھر اُدھر مت سوؤ۔ چلو میری کوٹھری میں میرے ساتھ رہو۔“

پھر تھوڑی دیر کے بعد دونوں نانی نواسہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہوئے اور بتولن بی اپنے زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر کراہتی ہوئی، بڑی دقتوں سے، آہستہ آہستہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ارے کا اُٹھیں بابو، ای بے جان بدن میں کوئی اب دم رہا۔ ای بوڑھی ہڈی کب تک چلے گی بابو“۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئیں اور بولتی گئیں، ”کا (کیا) جلوتم تو بیمار پڑ کے بڑا تنگ کرو ہو بابو۔ چلو چلو، ارے بھائی اُٹھو نے...... چلو نے۔“

جلّو نے اپنی تھکی آنکھوں کو اُوپر اُٹھا کر نانی کو دیکھا اور اُٹھ کر ان کے ساتھ اپنی کوٹھری میں جانے لگا۔

”دیکھو بُنّی، کوئی حلاوت اس کے جان میں ہے؟“

ان کے لہجے میں ایک ایسی انفرادیت تھی، ایسا انوکھا انداز تھا کہ وہ خاص لب ولہجہ انہیں کی ذات سے وابستہ تھا۔ اس انداز میں میں نے کبھی بھی دوسروں کو گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی زبان سے اَدا کیے ہوئے جملوں کو سن کر بھی بے حد لطف اندوز ہوتے۔ ان جملوں کی خاصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ ایک خاص کیفیت کے آئینہ دار ہوتے تھے۔

اس دن میں علی الصبح اُٹھ کر دالان کی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ دروازے سے کنڈلی کے ہلنے کی آواز آئی۔ میں چونک گئی اور پھر اپنی کرسی سے اُٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ کھانا پکانے والی بوا دروازے پر تھیں۔ میں نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا اور وہ گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ پھر میں نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی کہ انار کے درخت کی پشت پر جو بتولن بی کا ایک کمرہ تھا وہاں سے ان کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ بتولن بی کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔ میں ان کے کمرے کے اور بھی قریب چلی گئی۔ بتولن بی بولے چلی جارہی تھیں......

''اُٹھو بیٹا، اُٹھو بھائی! رات کا کھانا بھی نا کھائے ہو۔ اب تو اُٹھ کے ناشتہ کرلو۔ اُٹھو چلو......اُٹھو جی۔''

یہ سب سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ بتولن بی جلّو میاں کو اُٹھا رہی ہیں۔ میں یہ سن کر آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ بتولن بی کی آواز پھر سے آنے لگی۔

''ہائے ہائے......ایسے کاہے ہور ہے ہو جلّو؟ ہائے ہائے ہائے......ارے کوئی ہے......دیکھو بِٹی، جلّو نا اُٹھ رہا ہے......''

میں جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ جلّو تو اپنی نیند میں ہی تیرتے ہوئے دوسری دُنیا میں پہنچ چکے تھے۔ بتولن بی پکارتی رہیں...... پکارتی رہیں، پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگیں۔ اتنی زور زور سے رونے لگیں کہ گھر کے سارے لوگ ننگے پاؤں دوڑ کر اس چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گئے۔

میں نے جلّو کا پُرسکون چہرہ دیکھا تو ایسا لگا کہ اس کی معصوم، دھیمی دھیمی سے شرارتوں میں جیسے ایک ٹھہراؤ آگیا۔ ابھی سورہا ہے، لیکن شاید کسی پل بھی تکان دُور کر کے اُٹھنے والا ہے۔ بتولن بی کی پہنائی ہوئی ہری

چوکور تعویذ ڈھلک کر گردن کے ایک طرف ہو چکی تھی۔ گلے میں چھوٹا سا بٹوہ، جس میں بُن دھنیا (دھنیا، ناریل، میوہ جات اور چھوہارے کا مکسچر) تھی۔ نارا اور بادلے کی بدھیاں، لال اور ہری بدھیوں میں سنہرے اور روپہلے بادلے کی لپیٹ جس کے جھلملاتے ہوئے عکس کی شعاعوں میں جلّو کا معصوم چہرہ چمک رہا تھا۔ سفید جالی کی گنجی کے اوپر ہرے ململ کے کرتے کا گریباں کسی شہید سالار کی طرح چاک پڑا تھا۔ محرّم کے اکھاڑے اور جلوس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے جو تلوار خریدی تھی وہ سرہانے ہی پڑی تھی، جیسے وہ جنگجو کسی جنگ سے نیزہ بازی اور شمشیر زنی کر کے ابھی ابھی واپس لوٹا ہو۔ آنکھیں بھی گرد و غبار سے یوں اَٹی ہوئی تھیں جیسے وہ نیزوں اور تلواروں سے لڑتے بھڑتے بس ابھی تھک کر سویا ہو۔ جس کی معصومیت اور ہمّت پر فرشتے اپنی معتبر شہادت دے دے کر بے حال ہو رہے ہوں۔

کل ہی تو ہاتھ میں اپنی پلاسٹ کی تلوار اور ڈھال لے کر آنگن کے بیچوں بیچ جلّو میاں اپنا ہاتھ 'شپاشپ' چلا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ''یا حسینؓ...... یا حسینؓ'' کا نعرہ لگا رہے تھے اور آج جیسے حسنؓ اور حسینؓ کے شانہ بہ شانہ کئی دُشمنوں کو تہہِ تیغ کر کے بے سُدھ پڑے ہوئے ہوں۔ میں نے ایک دن قبل ہی جلّو سے پوچھا تھا جو برآمدے کے تخت پر بیٹھے تھے۔

''تب جلّو، کل تو محرّم ہے، کیا ارادہ ہے؟ جلوس کے ساتھ ساتھ تو تم بھی جاؤ گے۔''

کہنے لگا، ''ہاں ہاں، مجھے تو جانا ہے۔ میرا ہرا کرتا اور سب چیزیں تیار ہیں۔ نانی نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے تلوار خرید کر دیں گی۔ اب کی (اس بار) تو ایسا ایسا تعزیہ، سپر اکھاڑے میں آنے والا ہے کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ میں اپنی تلوار سے جی جان لگا کر لڑوں گا...... آپ دیکھنا۔''

ننھے جلّو کی معصومانہ باتیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ ننھا جاں باز معرکہ آرائی سے تھک کر سکون کی نیند سو گیا تھا۔

سحر کے بعد اس کی آخری نشانی بھی رُخصت ہوئی۔ بتولن بی کو جیسے سکتہ لگ گیا تھا۔ اب وہ بہکی بہکی باتیں کرتیں۔ کبھی گھنٹوں خاموش رہتیں، تو کبھی اپنے ماضی میں جینے لگتیں اور بے تکان بولتی جاتیں۔ کبھی سحر کو سرزنش کرتیں تو کبھی ٹائیگر کو گالیاں کوسنے دیتیں۔ اور کبھی سبزی والوں سے بحثا بحثی کرتیں۔ یوں ہی شب و روز گزرتے گئے اور ایک برس کے اندر وہ بھی خاموشی سے اپنے آخری سفر کو چل دیں۔

انار کے درخت کے پیچھے بنی وہ کوٹھری پھر کسی سے آباد نہ ہو سکی، لیکن میرے دل کے داغ اسے دیکھ کر جل اُٹھتے ہیں۔ آخر کار دل کے یہ پھپھولے لفظوں کے پیکر میں ڈھل گئے اور میں نے ان کی کہانی کو کاغذ پر اُتارنے کی ٹھان لی اور اس طرح میں نے یہ کہانی لکھ دی۔ لکھنے کے بعد پھر میں بہت روئی کہ اتنا سا کاغذ اور تھوڑی سی قلم کی روشنائی...... کیا یہی اس عورت کی زندگی بھر کا حق مجھ پر تھا؟...... حضرت علیؓ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس نے ایک حرف بھی مجھے سکھا دیا، میں اس کا غلام ہوں، چاہے وہ مجھے بیچ دے یا مجھے آزاد کردے۔ اس عورت نے ایک عمر ہمارے یہاں گزار دی اور اپنے خلوص و محبت کا پورا سرمایہ ہمارے سپرد کرگئی۔ جب ایک حرف کا اتنا بڑا حق ہے تو اس پوری کہانی کا مجھ پر کیا حق ہوگا؟ اس سوچ نے مجھے بہت رُلایا۔ میں نے ان کے خلوص و محبت اور شفقت کا قرض اُتارنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ گرچہ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ محبتوں کے قرض اُتارے نہیں جاسکتے۔ محبت کو تو صرف دل میں بسا کر ہی اس کا

خراج اَدا کیا جاسکتا ہے۔ ہم لوگوں کے گھر سے وابستہ یہ کردار میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئے۔ میں انہیں کبھی بھول ہی نہ پائی۔ بس یہی تشفی مجھے ہے کہ ان کی قیمتی باتیں، ہیرے جواہرات جیسی یادیں، میرے وجود میں جذب ہوگئی ہیں۔ یہی میری دولت ہے، میری کمائی ہے، میری پونجی ہے۔ میری شاعری کے حرفوں میں اور میری مصوّری کے رنگوں میں، ہر جگہ ان کی یادیں اپنے گہرے نقوش ثبت کر رہی ہیں۔ ان کا خلوص اور ان کی محبتیں میرے تخلیقی جہان میں قدم قدم پر، مختلف شکلوں میں اپنی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہیں۔ اس عورت کا یہ بڑا فیض، بڑی برکت مجھ پر ہے۔

رواداری، نرم روی، انکساری، وفاداری، جاں فشانی، خلوص، مروّت، اپناپن...... گئے وقتوں کی باتیں ہیں۔ آج کے معاشرے میں یہ سکے نایاب ہیں۔ وقت کا پہیہ اُلٹا کہاں چلتا ہے؟...... ورنہ دل تو وہی اُلفت اور لطافت بھرے رات اور دن کو ڈھونڈتا ہے، لیکن...... اب نہ وہ زمانہ رہا اور نہ ویسے لوگ رہے......!!!

❀❀❀

صوفیہ انجم تاج

صوفیہ انجم تاج کا ناول ''سفر کا درد'' ایک چھوٹے سے کنبے کی کہانی ہے۔ ہر چند کہ اس ناول کی بیان کنندہ خود مصنفہ ہی ہے لیکن مصنفہ کی شخصیت صرف ایک فریم کا کام کرتی ہے جس کی شخصیت کے حوالے سے بتولن کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بی بتولن ایک امیر گھرانے کی بہو تھیں لیکن وقت کے جبر نے انہیں امیری کے مرتبے سے گرا کر نوکرانی کی حقیر اوقات تک پہنچا دیا۔

ناول کا پلاٹ اگرچہ پیچیدگی سے خالی، سادہ اور مختصر ہے لیکن اس کی خوبی بتولن کے کردار کی تصویر کشی اور ہندوستانی مسلمان شرفاء کے گھروں کے ماحول اور ان کی گفتگو کے بیان میں ہے۔ پورے ناول کے ماحول پر بتولن چھائی ہوئی ہے۔ زمانہ یا تقدیر کے ہاتھوں اسے بار بار دھکے لگتے ہیں لیکن وہ اپنی مستقل مزاجی کے بل پر زندگی گزار لیتی ہے۔ مقاومت اور تحمل کی اس داستان میں شاید ہم سب کے لیے کچھ اشارہ بھی پنہاں ہے۔

صوفیہ انجم تاج کا قلم کہیں کہیں جادو جگاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر جب وہ کسی گھریلو منظر کو پیش کرتی ہیں، اس وقت ان کی زبان پختگی اور بے ساختگی کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہے۔ عورتوں کے محاوروں اور گفتگو کے لہجے پر صوفیہ انجم تاج کو مکمل قدرت حاصل ہے۔ بڑی بات یہ ہے ان کی زبان میں پورب کی زبان کے خوشبو اور رنگ ہیں۔ اب یہ خود پورب میں آہستہ آہستہ نایاب ہوئے جا رہے ہیں۔

تین دہائیوں کے واقعات (یہ واقعات زمانۂ حاضر کے نہیں بلکہ مصنفہ/ بیان کنندہ کی نوعمری کے واقعات ہیں) پر مشتمل اس مختصر ناول میں کیفیت کی ایک شدّت ہے اور گزشتہ باتوں کو زندہ رکھنے کا مصمم ارادہ ہے اور یہی چیز اس ناول کو عام سطح سے بلند کر دیتی ہے۔ بیان کنندہ کے الفاظ میں، ''محبتوں کے قرض اُتارے نہیں جا سکتے۔ محبت کو تو صرف دل میں بسا کر ہی اس کا خراج اُدا کیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگوں کے گھر سے وابستہ یہ کردار میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئے۔''

مجھے یقین ہے کہ یہ ناول پورب کے مسلمان گھرانوں کی تہذیب کی ایک زندہ رہنے والی یادگار ثابت ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی